NATIONAL PRESS URDU LITERATURE SERIES No 32.

مؤلفہ

سیّد اختر احمد اختر اورینوی ایم۔اے

لکچرار شعبۂ اردو پٹنہ گورنمنٹ کالج پٹنہ

پبلشر

رام نرائن لعل بکسیلر

الہ آباد

بار اوّل — سنہ ۱۹۴۲ء — قیمت ۱۲/

فہرست مضامین

پیش لفظ

اقبالؔ اُن خوش قسمت فن کاروں میں سے تھا جن کی قدر اُن کی زندگی میں ہی ہوتی ہے۔ ہمارے زمانے میں جس شاعر نے سب سے زیادہ ایشیائی فکر و خیال کو متاثر کیا ہے وہ اقبال ہے۔ اقبالؔ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں اقبالؔ کے جیتے جی ہی شروع ہو چکی تھیں۔ گذشتہ سالوں کے اندر اس سعی میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اور یہ سلسلہ جاری نظر آتا ہے۔ میری یہ ناچیز کاوش مذکورہ شاندار زنجیر کی ایک کڑی نہیں۔ یہ کتاب تو طلبائے کالج کی ابتدائی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے منظرِ عام پر لائی گئی ہے۔ اب تک اقبالؔ کی داخلِ درس نظموں اور غزلوں پر تشریحی روشنی نہیں ڈالی گئی تھی اور نہ طلبا کے سامنے کوئی ایسی کتاب ہی تھی جو اقبالؔ کی شاعری سے مختصر مگر مکمل و واضح انداز میں بحث کرے۔ میرے دو محترم بزرگوں نے میری توجہ اس طرف منعطف کرائی۔ جناب پروفیسر حافظ شمس الدین احمد صاحب ام۔ اے، صدر شعبۂ اُردو پٹنہ کالج اور جناب پروفیسر

عبدالمنان صاحب بیدل ایم۔ اے، صدر شعبۂ فارسی پٹنہ کالج کی تحریک نے مجھ میں اس کتاب کے لکھنے کی جرأت پیدا کی۔ میں اقبال کے سب تنقید نگاروں کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اقبال کی تفہیم میں مدد دی ہے۔

۴ اگست ۱۹۴۱ء

سیّد اختر احمد اختر اورینوی

ادبستان۔ پٹنہ
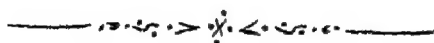
حیاتِ اقبال

اقبال گہوارۂ فطرت کشمیر کی ایک طبّاع نسل کا فرد تھا۔ اُس کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تھا جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ یہ خاندان ایک مسلمان ولی کی تبلیغ و حُسنِ عمل سے مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ اِس کو کوئی ڈھائی سو سال ہوئے۔ کشمیری پنڈت برہمن ہیں۔ "سپرو" کا خاندان اقبال کے خاندان کی گوت ہے۔ یہ کشمیری برہمن زادے بڑے زیرک و فہیم، تیز اور نکتہ رس ہوتے ہیں۔ اقبال خود کہتا ہے۔ "برہمن زادہ و رمز آشنائے روم و تبریز است!"

اقبال ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ (پنجاب) پیدا ہوا تھا۔ اقبال نے مکتب و مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ پانچویں جماعت کا امتحان وظیفہ لے کر پاس کیا۔ مڈل میں بھی یہ اعزاز ملا اور انٹرنس میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ اقبال ابتدا سے ہی بہت ہی ذکی و ذہین تھا۔ ایف۔ اے کا زمانہ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں گزرا۔ یہاں

مولانا سید میر حسن سا عالم متبحر موجود تھا اُنھوں نے بڑی شفقت سے اقبالؔ کی مشرقیت کی نیو ڈالی۔ اقبالؔ میں عربی و فارسی کا مذاق صحیح انھیں کی فیضانِ صحبت سے پیدا ہوا۔ سیالکوٹ کالج سے فراغت حاصل کر کے اقبالؔ لاہور گورنمنٹ کالج کی بی۔ اے کلاس میں داخل ہوا۔ انگریزی، عربی اور فلسفہ میں نام پیدا کیا۔ وظیفہ اور طلائی تمغے ملے۔ پروفیسر آرنلڈ اقبالؔ کی فلسفہ دانی اور اُس کے ذہن رسا کے معترف تھے۔ اِس جوہر قابل کی پرورش آرنلڈ نے خوب کی۔ اقبالؔ بھی آرنلڈ کا گرویدہ تھا۔ شاندار طور پر ام۔ اے میں کامیاب ہونے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ اور سیاست مدن کی لکچراری اقبالؔ کو ملی۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کا مددگار پروفیسر مقرر رہا۔ اقبالؔ ذہین و سعادت مند شاگرد تھا اور اب ایک شفیق، بے تکلف اور مہربان اُستاد ثابت ہوا۔ اِسی دَور میں اُردو زبان میں اقبالؔ نے ایک کتاب علم الاقتصاد نام کی لکھی۔

اقبالؔ کو تحقیقات علمی کا بے حد شوق تھا۔ اِسی شوق نے اُسے دیارِ مغرب میں جا پہنچایا۔ تین سال وہاں گزرے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق کی ڈگری ملی۔ پھر جرمنی کی میونچ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی فرسٹ کلاس ڈگری ایک مقالہ بنام ”فلسفۂ ایران“ لکھنے سے

حاصل کی۔ اِس کتاب کا ترجمہ اب اُردو زبان میں بھی ہو چکا ہے۔
جرمنی سے واپس آنے کے بعد لندن کے اسکول آف
پولیٹکل سائنس میں داخل ہوا اور وہاں کے علماء و حکماء اور
انگلستان کے دیگر فضلاء سائنس دانوں اور مُدبّروں سے استفادہ
حاصل کیا۔ نیز بیرسٹری کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔
دَورانِ قیامِ انگلستان میں اقبالؔ نے "اسلام" پر چھ لکچر
دیئے۔ جس سے اُس کی مذہبی تحقیقات کی بھی دھوم مچ گئی۔
چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام
کی حیثیت سے اقبالؔ عربی کا پروفیسر بھی رہا۔
شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ۔ "اقبال کو اپنی علمی منازل
طے کرنے میں اچھے اچھے رہبر ملے اور بڑے بڑے علماء
سے سابقہ پڑا۔ اُن لوگوں میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر نیک ٹیگرٹ،
براؤن، نکلسن اور سارلی قابلِ ذکر ہیں..........اِسی طرح
ہندوستان کی علمی دُنیا میں جتنے نامور اُس زمانے میں موجود
تھے۔ مثلاً مولانا شبلی مرحوم، مولانا حالی مرحوم، اکبر مرحوم سب
سے اقبالؔ کی ملاقات اور خط و کتابت رہی۔ اور اِن کے اثرات
اقبالؔ کے کلام پر اور اقبالؔ کا اثر اُن کی طبائع پر پڑتا رہا۔
مولانا شبلی نے بہت سے خطوط میں اور حضرت اکبر نے
نہ صرف خطوں میں بلکہ بہت سے اشعار میں اقبالؔ کے کمال

سکا اعتراف کیا ہے اور اقبالؔ نے اپنی نظم میں ان باکمالوں کی جابجا تعریف کی ہے"۔

۳۲-۳۳ سال کی عمر میں علمی اعزاز اور بہت سی ڈگریاں لے کر اقبالؔ جولائی ۱۹۰۸ء میں لاہور واپس آیا۔ اقبال عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں کا اچھا جاننے والا تھا۔ انگریزی پر تو اُسے عبور حاصل تھا۔

شاعری

"طبیعت میں علم ادب سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی سید میر حسن سے کی۔ سونے پر سہاگا ہوگیا۔ ابھی اسکول ہی میں پڑھتا تھا کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔ پنجاب میں اُردو کا رواج اس قدر ہوگیا تھا کہ ہر شہر میں زباں دانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔ سیالکوٹ میں بھی شیخ محمد اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے اقبالؔ نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کردی۔ شعرائے اُردو میں اُن دنوں نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی کا بہت شہرہ تھا۔ اور نظامِ دکن کے اُستاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ جو اُن کے پاس جا نہیں سکتے تھے، خط و کتابت کے ذریعہ دور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے۔

شیخ محمد اقبال نے بھی انھیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ گو اُس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہ تھیں جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی ۔ مگر جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور اُفتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ اُنھوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہیں رہا۔ البتہ اُس کی یاد دونوں طرف رہ گئی ...... داغ مرحوم اِس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی اُن لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی اُنھوں نے اصلاح کی...." اُسی زمانہ میں لاہور کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ رسالہ "شورش محشر" میں شائع شدہ غزل کے ایک شعر میں اقبال کہتا ہے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال، کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

ابتدائی کلام میں زیادہ تر غزلیں ہی ملتی ہیں۔ اور چونکہ اقبال نے "بانگِ درا" میں اپنا پرانا کلام اور خصوصاً غزلیں بہت کم درج کی ہیں۔ اِس لئے وہ نایاب ہیں۔ بیس بائیس سال کی عمر میں اقبال نے ایک مشاعرہ میں جب اپنی ایک غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اساتذہ کے درمیان میں بھی دھوم مچ گئی۔ رفتہ رفتہ لاہور میں اقبالؔ کی شہرت ہونے لگی۔

اقبالؔ تنگ نائے غزل میں محدود نہیں رہ سکتا تھا اور نہ وہ رہا۔ اُس نے نظموں کی طرف توجہ کی۔ ۱۸۹۹ء میں "نالۂ یتیم" نامی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں بڑے سوز و گداز سے پڑھی۔ جس سے اُس کی شہرت ہندوستان کے ہر علمی و ادبی حلقہ تک پہنچ گئی۔ اُس کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آیند تھی، اور مترنم بھی۔ خواص کی پسندیدگی کے ساتھ عوام کی دلچسپی بھی اقبالؔ کی نظموں کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔

شیخ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں۔ "شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بیشمار شعر ہو جاتے تھے۔ اِن کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دُھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اُس زمانہ میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً اُن پر طاری ہوتی تھی۔ اپنے اشعار سُریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے

اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر اس طرح زبان سے نکلیں اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اُسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ ہوتے ہیں، جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے۔ اور درمیان میں خود وہ انھیں قلمبند بھی نہیں کرتے.......... اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزونیِ طبع وہ حسب فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہیں۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر چاہیں کہہ دیں۔ مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسب فرمائش وہ کچھ لکھ سکیں، یہ قریب قریب ناممکن ہے"۔

مگر انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں کئی سال متواتر اقبال اپنی نظمیں سُناتا رہا۔ جو خاص اُسی جلسہ کے لئے لکھی جاتی تھیں اور جس کی فکر پہلے سے کی جاتی تھی۔ اِن جلسوں کے علاوہ اقبال رسالہ مخزن کے لئے بھی لکھا کرتا تھا۔ مدیر مخزن شیخ عبدالقادر بانگ درا کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "اِس اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے اِن سے وعدہ لیا کہ اس رسالہ کے حصّہ نظم کے لئے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا کہ میں اُن کے پاس گیا اور میں نے اُن سے کوئی نظم مانگی۔

اُنھوں نے کہا ابھی کوئی نظم تیّار نہیں ہے۔ میں نے کہا "ہمالہ" والی نظم دے دیجئے۔ اور دوسرے مہینے کے لئے کوئی اور لکھئے۔ اُنھوں نے اُس نظم کے دینے میں پس وپیش کیا کیونکہ اُنھیں یہی خیال تھا کہ اِس میں کچھ خامیاں ہیں۔ مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت مقبول ہوگی اِس لئے زبردستی میں نے وہ نظم اُن سے لے لی اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا شائع کردی۔............ ۱۹۰۵ء تک جب وہ ولایت گئے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اِس عرصہ میں وہ عموماً مخزن کے ہر نمبر کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے"

غزل نگاری کے بعد اقبال نے وطن پرور شاعری شروع کی تھی۔ اِس کی ابتدا ہمالہ سے ہوئی۔ اِس کے بعد اور کئی نظمیں لکھی گئیں۔ اقبال اتّحادِ وطن پیدا کرنے کے لئے بے چین تھا۔ خصوصاً قیامِ یورپ کے زمانہ میں وطن کی زبوں حالی سے بہت متاثر تھا۔ "تصویرِ درد" "نیا شوالہ" "ترانۂ ہندی" "ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت" اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں۔

دورانِ قیامِ یورپ میں اقبال کے اندر نوع در نوع تاثرات پیدا ہوتے رہے۔ مغرب کی بلندی اور مشرق کی پستی نے شاعر کو بہت تڑپایا۔ وہ عرصہ تک اُمید و نا اُمیدی کے جنجال میں پھنسا رہا۔ آخر اُس کا ارادہ مصمّم ہوگیا کہ وہ شاعری کو ترک کردے اور وقت

کو کسی اور مفید کام میں صرف کرے۔ شیخ عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ
کے سمجھانے بجھانے سے اُس کی رائے بدلی۔ اُسے بتایا گیا
کہ اُس کی شاعری احیاء ملّت کے لئے بارانِ رحمت ہے
نہ کہ ایک فعل لاحاصل۔

"سنہ ۱۹۱۱ء اور سنہ ۱۹۱۲ء کی تاریخ نے مسلمانانِ عالم کے لئے
کربلائے جدید کا ایک نیا باب کھولا"۔ جنگِ بلقان اور طرابلس الغرب
کی لڑائیوں میں مسلمانوں کا خون ارزاں ہو رہا تھا۔ اسلام کا سیاسی
رُعب و دبدبہ مٹنے کو تھا اور یورپ کے صلیب پرست پھر ایک بار
فرزندانِ توحید پر ظلم ڈھانے کے لئے اپنے شیطانی لشکر بڑھا
لائے تھے۔ سارے عالمِ اسلامی میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی تھی۔
ہمارے قومی شاعر کے دل میں بھی جذبات موجزن ہوئے۔ اُس
نے معرکہ آرا نظمیں لکھیں اور محفلوں میں شورشیں برپا کر دیں۔ یہاں
سے اقبالؔ کی اسلامی اور بین الملّی نظموں کا دور شروع ہوتا ہے۔
مثلاً خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام وغیرہ۔

ابتدائی قیامِ لندن کے زمانے میں اقبالؔ کو فارسی میں شعر کہنے
کی یوں تحریک ہوئی کہ ایک محفل میں کسی دوست نے اُن سے فارسی
کلام سُنانے کی فرمائش کی۔ اُس وقت تک وہ فارسی گوئی کی طرف
مائل نہیں ہوئے تھے مگر کچھ ایسا وقت تھا کہ اقبالؔ پر اُس کا اثر ہوا
اور دوسری ہی صبح سے فارسی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ مگر اِس کے

اور بھی اسباب ہیں۔ فارسی کا بکثرت مطالعہ، علم فلسفہ و عمرانیات پر کامل عبور اور بین الملّی سیاسیاتِ اسلامیہ سے گہری دلچسپی ۔ یہ تین وجوہات ہیں جو اقبالؔ کو فارسی نوائی کی طرف لائے۔ دقیق خیالات کے اظہار اور وسیع عالمِ اسلامی سے تخاطب کا ذریعہ بننے کی اہل فارسی اُردو سے زیادہ تھی۔ ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اُردو کی نظمیں بھی کہتے تھے۔ مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہو گیا۔ یہ اقبالؔ کی شاعری کا تیسرا دَور ہے جو ۱۹۰۸ء کے بعد شروع ہوا۔ اس عرصہ میں اُردو نظمیں بھی ہوئیں اور اچھّی اچھّی جن کی دھوم مچ گئی۔ اس عہد کا پہلا ثمر فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" تھی۔ اِس کے ذریعہ اقبالؔ کا نام ہندوستان سے باہر بھی پھیلا۔ اِس کے بعد "رموزِ بیخودی" اور "پیامِ مشرق" تصنیف ہوئی ۔ پھر "زبورِ عجم" اور "جاوید نامہ" آخر الذکر دو کتابیں ابتدائی دَور کے بعد لکھی گئیں۔

شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں "فارسی گوئی کا ایک اثر اقبالؔ کے اُردو کلام پر یہ ہوا ہے کہ جو نظمیں اُردو میں دَورِ سوم میں لکھی گئیں، اُن میں سے اکثر میں فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں پہلے سے بھی زیادہ ہیں..."

اقبالؔ نے خود اپنے شعر ؎

گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے　　شمع یہ سودائی دل سوزیِ پروانہ ہے

سے متاثر ہو کر ۱۹۳۵ء میں "بالِ جبریل" اُردو میں شائع کی اور بعد ازاں "ضربِ کلیم" بھی اُردو ہی میں اشاعت پذیر ہوئی۔ "ضربِ کلیم" کے بعد دو اور فارسی مثنویاں شائع ہوئیں۔ "مسافر" اور "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"۔ اقبالؔ کے انتقال کے بعد اُردو اور فارسی کا متحدہ مجموعہ "ارمغانِ حجاز" نکلا۔

۱۹۰۱ء میں اقبالؔ نے ملکۂ وکٹوریہ کے انتقال پر ایک درد انگیز نظم لکھی۔ ایک گورنر صاحب کی شان اور علم کی تعریف میں ایک قطعہ ۱۹۰۳ء میں لکھا۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں ایک نظم لکھی۔ اِن چیزوں نے حلقۂ سرکاری میں اقبالؔ کی شہرت پیدا کی۔ لیکن حکومت اقبالؔ کی قدر و قیمت سے اُس وقت واقف ہوئی جب اسرار و رموز کے ترجموں کے ذریعے یورپ بھر میں اُس کا ڈنکا بجنے لگا۔ چنانچہ اقبالؔ کو نائٹ (سر) کا خطاب ملا۔

دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری دِنوں میں چند لکچر دینے کے لئے مدراس میں اقبالؔ کو مدعو کیا گیا۔ اخبارات، علمی مجلسوں، فلسفہ کے علماء اور علاقہ کے ہندو مسلمانوں میں اُس کا طوطی بولنے لگا۔ میسور کے مہاراجہ نے اُسے بنگلور مدعو کیا اور وہاں کی یونیورسٹی میں بھی اقبالؔ نے علمی لکچر دیئے۔ سبھوں نے اُسے ایک عظیم المرتبت ہندوستانی شاعر تسلیم کیا۔ اقبالؔ کے خطبات مدراس الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید سے متعلق ہیں۔ یہ کتاب انگریزی میں شائع ہو چکی ہے۔

اقبال کی زندگی کا بیشتر حصّہ علمی مشاغل میں گزرا لیکن عقیدتمندوں اور دوستوں کے اصرار سے اُسے سیاسیات میں بھی حصّہ لینا پڑا۔ ۱۹۲۶ء کے نومبر میں سب سے پہلی بار پنجاب کونسل کا رُکن منتخب ہوا۔ کونسل میں اُس نے جمہور مسلمانوں اور ہر مذہب و ملّت کے مزدوروں اور کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سعی کی۔ مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں پر کمینہ حملہ کرنے والوں کے خلاف قانون پاس کرایا اور پنجاب کے کسانوں کو سرمایہ داروں کے پنجے سے نجات دلوانے کے لئے بڑی تگ و دَو کی۔

۱۹۳۲ء کے اجلاس کونسل میں اقبال نے نظام محاصل کی بے ضابطگیوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ زمینیں حکومت کی ملکیت نہیں بلکہ قوموں کی ملکیت ہیں۔ اُس نے اِس بات پر بہت زور دیا کہ انکم ٹیکس جو اُمراء سے لیا جاتا ہے اُس میں تو تدریجی پیمانہ مقرر ہے اور کسانوں سے مالیہ لینے میں ایک ہی سپاٹ پیمانہ برتا جاتا ہے۔ چند کنال والے غریب کسان کو بھی مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ظلم ہے اِسے مٹایا جائے۔

اقبال کشمیری کانفرنس اور آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا سکریٹری رہا ہے اور جب غریب اور مظلوم کشمیریوں پر ظلم کی انتہا ہوگئی تو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا انعقاد ہوا۔ اقبال اِس میں بھی دوسرے زعمائے ملّت کے ساتھ شریک تھا۔ حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد

امامِ جماعتِ احمدیہ اس کمیٹی کے صدر تھے۔ اِس انجمن نے کشمیریوں کی بہت خدمت کی۔

اقبالؔ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی کامیاب صدارت بھی کی اور ہندوستان کی سلطنت کے نظام کے متعلق بصیرت افروز مسئلوں کو منظرِ عام پر لایا۔ گول میز کانفرنس میں اُس نے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی اور سیاسی و دستوری بحث و تمحیص میں نمایاں حصّہ لیا۔

ہر چند کہ اقبالؔ خود کہتا ہے کہ ؎

اقبالؔ بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

اور یہ کہ ؎

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

تاہم وہ سماجی، سیاسی، اور اقتصادی مسئلوں اور مختلف عالمگیر تحریکوں سے ہمیشہ متاثر ہوتا رہا اور اپنی شاعری میں اُن تاثرات کو اپنے انفرادی تجربہ کی شکل میں پیش بھی کرتا رہا۔

اقبالؔ کی شخصیت بہت ہی پُراثر تھی۔ ابتدائے طالب علمی ہی سے وہ رونقِ محفل تھا۔ وہ ایک مخلص دوست اور گرم جوش مہمان نواز تھا۔ اُس کی گفتگو میں سحر ہوتا تھا۔ اقبالؔ کے گھر پر علمی صحبتیں برپا ہوتی رہتی تھیں۔ اِن محفلوں میں اقبالؔ بلبلِ ہزار داستان

کی طرح چمکتا رہتا تھا۔

اقبالؔ کی نوجوانی بھی رنگینیوں سے لذّت آشنا تھی:۔

کچھ عار اِسے حُسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پُرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اِس رمز کے اب تک نہ کھُلے ہم پہ معانی
مجموعہ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوّف کی تو منصور کا ثانی

(بانگِ درا۔ زُہد و رندی)

تفکّر، ذہنی بلندی، جوش، حقیقت بینی، اور آزاد خیالی کے ساتھ اُس کی سیرت میں تھوڑی سیمابیت اور کچھ رومانی ابہام بھی پایا جاتا تھا۔ خود کہتا ہے۔ ؎

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنّا ہے کہ اقبالؔ کو دیکھوں — کی اُس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبالؔ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اِس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

یہ رومانی لطافت اور حقیقت آشنا حکمت کے امتزاج سے

بنی ہوئی پُرعظمت شخصیت اپریل ۱۹۳۸ء میں عالمِ بالا کو چلی گئی۔

اقبالؔ اہلِ نظر کی نگاہ میں

اقبالؔ کی مقبولیت اور شہرت کا یہ عالم تھا کہ اُس کی زندگی ہی میں اُس کے سوانح حیات اُردو اور انگریزی میں لکھے گئے۔ اُس کی شاعری پر بڑے بڑے اہلِ علم و اہلِ الرّائے حضرات نے تبصرے کئے۔ اُس کی حیات افروز نظموں سے متاثر ہوکر ہمعصر شعراء نے اُس کی تعریف و توصیف میں نغمے گائے۔

مولانا غلام قادر گرامیؔ فرماتے ہیں۔ ؎

در دیدۂ معنی نگہبان حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

مولانا حامد حسن قادری فرماتے ہیں۔ ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کی فیضِ طبع نے اُردو کو گنجِ زر دیا
اِک[1] اثر میں بڑھ گیا اِک[2] رفعتِ تخئیل میں
تیسرے[3] کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری ہیں بس یہی دونوں کمال
تیسرے میں اِس لئے دونوں کو یکجا کر دیا

---

[1] میرؔ دہلوی [2] غالبؔ دہلوی [3] اقبالؔ۔

خان اصغر حسین نظیر لدھیانوی کہتے ہیں۔ ؎

خیمہ زن در وادئے طور شِ کلیم　　شعر او تفسیر قرآن حکیم

ڈاکٹر عبد الرحمان بجنوری فرماتے ہیں۔ "اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا۔ جس نے مُردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے"۔

حُسین دانش ترکی فاضل نے ترکی زبان میں اقبال کی بہت سی نظموں کا ترجمہ کیا اور "پیامِ مشرق" پر تبصرہ لکھا۔ جناب آغا ہادی حسن صاحب کابلی نے پیامِ مشرق پر تنقید لکھ کر افغانی جرائد میں شائع کی۔ جناب احمد رفعت مصری نے اقبال کی بہت سی نظموں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اور یہ تراجم مصر کے مشہور جریدہ الاہرام میں شائع ہوئے۔ غرض افغانستان، ایران، ترکی، مصر وغیرہ ممالک اسلامیہ میں اقبال کی شاعری موجِ نسیم کی طرح پھیل گئی۔

مشرق کے علاوہ مغرب نے بھی نغمۂ اقبال پر سر دُھنا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے اسرارِ خودی کو انگریزی لباس پہنایا اور مقدمہ لکھا۔ ڈاکٹر براؤن نے اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمہ پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ میں تبصرہ لکھا اور تاریخ ادبیات فارسی کی آخری جلد میں اقبال کی شاعری کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر فشر پروفیسر لپزگ یونیورسٹی (جرمنی) اڈیٹر "اسلامیکا" نے جرمن زبان میں پیامِ مشرق پر تبصرہ لکھا۔ جرمنی کے مستشرق ڈاکٹر ہانسی مائنکے نے جو ایک مشہور فلسفی شاعر تھا نہایت

حُسنِ عقیدت اور فرطِ محبّت سے پیامِ مشرق کے ایک خاص حصّہ کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ پھر اسے چمڑے پر جیسے عموماً انجیل اور دوسری مقدس کتابیں لکھی جاتی ہیں، اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر اور مشرقی انداز میں نقش و نگار کے ساتھ اقبالؔ کے پاس تحفتہً ارسال کیا۔ ڈاکٹر سکاریہ نے اٹلی میں اقبالؔ کے متعلق ایک پُر مغز مضمون لکھا۔ ایک روسی نے اسرارِ خودی کے نظریات کو روسی زبان میں قلمبند کیا۔ ڈاکٹر سپوزمے نے "شکوہ" کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ مسٹر میکنزی امریکی نے اپنی کتاب ہندوستان کی بیداری میں اقبالؔ کا وضاحت سے ذکر کیا ہے۔

خصوصیاتِ عصرِ اقبالؔ

اقبالؔ کا زمانہ مسلمانانِ عالم بلکہ ساری دُنیا کے لئے بہت ہی اہم تبدیلیوں کا عہد تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں سرسیّد اور حالیؔ کے وقت ہی سے بیداری کے احساسات پیدا ہو چلے تھے۔ مُلک میں عام طور پر سیاسی اور سماجی تحریکات کی ابتدا ہو چکی تھی۔ تلک کے بعد گاندھی نے ہندوستان کو بیدار کیا۔ مولانا محمد علی و شوکت علی نے قیامِ خلافت اور آزادیٔ ہند کے نعرے لگائے۔ مسلم لیگ کے زعمار بھی برسرِکار تھے۔ رام موہن رائے اور دیانند نے ہندوؤں میں نئی مذہبی تحریکیں کیں۔ حضرت مرزا غلام احمد نے احیائے اسلام کے لئے ایک نظامِ نَو

کی بنیاد ڈالی۔ ہندو مسلم رقابت کو اغیار نے بھڑکایا اور اپنوں نے اتحاد کی طرح ڈالی۔ بات بگڑ بگڑ کر بنی اور بن بن کر بگڑی۔ برادرانِ وطن آپس میں خوب خوب لڑے۔ خیر خواہوں کا دل دُکھا۔ ہمدرد تصویرِ درد بن کر نالہ کناں ہوئے اور دشمنوں نے خوشیاں منائیں۔ شاطرانِ سیاست سارے ایشیا میں قیامت کی چالیں چلے۔

یورپ کے صنعتی و حرفتی انقلاب اور تاجرانہ و سرمایہ دارانہ جمہوریت نے ایشیا پر کے نظامِ قدیم کے خلاف ریشہ دوانیاں کر کے اُس پر یلغاریں کیں۔ ترکی، مصر، شام، فلسطین، عراق، ایران، افغانستان، برما، ملایا اور چین ہر جگہ زوال و انحطاط کے آثار نظر آنے لگے۔ سرمایہ داری نے جنگ زرگری شروع کی اور ایک وبا کی طرح سارے عالم پر چھا گئی۔ بلقان میں ترکوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ جنگِ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء نے سارے عالم میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ تہذیب و تمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔ جنگ کے بعد یونانیوں نے سمرنا اور ترکی کے دوسرے حصوں میں ظلم و قساوتِ قلبی کو انتہا تک پہنچا دیا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور غاصبوں نے سمجھا کہ اب یورپ کے پہلو کا خار نکل گیا۔ لیکن زمانہ یورپ کے لئے اور فتنوں کی پرورش کر رہا تھا۔

سرمایہ داری اپنا تاریخی کام انجام دے چکی تھی اور اب صرف

اُس کی خرابیاں اور نقائص اور زیادہ خراب تر اور ناقص تر ہو گئے۔ سرمایہ دارانہ وطنیت کا لازمی نتیجہ ممالک اور اقوام کے درمیان رقابت و جنگ و پیکار رہے۔ جنگِ عظیم ایشیا اور افریقہ کی خام پیداوار اور وہاں کے بازاروں پر قبضہ کے لئے حریف صنعتی مُلکوں اور اُن کے حاشیہ نشینوں کے درمیان لڑی گئی۔ اور ساری دُنیا اس آگ کی بھٹی میں محض اُن کی خاطر جھونک دی گئی۔ اِس جنگ سے پہلے ہی مزدور تحریک یورپ میں چل نکلی تھی۔ ہر مُلک میں مجالسِ عمّال قائم ہو رہی تھیں اور اہلِ محنت کے تیور اہلِ سرمایہ کے خلاف بگڑ رہے تھے۔ اشتراکیت اور فوضویت کی تحریکیں یورپ میں عام پسند ہو رہی تھیں۔ محنت کرنے والے بازو اور سوچنے والے دماغ ظالمانہ تقسیمِ دولت کے خلاف اپنا محاذ مضبوط کر رہے تھے۔ آخر کار روس میں انقلاب رونما ہوا اور جنگِ عظیم میں سرمایہ داری کی تھکی ہوئی فوجوں سے کچھ بنائے نہ بنی۔ دُنیا نے ایک بہت بڑے مُلک میں اشتراکیت اور اشتمالیت نے عوام کی حکومت کا پرچم اُڑا دیا اور آہستہ و یقینی طور پر اپنے استحکام کی طرف متوجہ ہوئی۔ سارے عالم میں مزدور اور کسان تحریکیں پھیلنے لگیں۔ اُمید ہو چلی تھی کہ جمہوریتِ انسانی کا دور دورہ ہو جائے مگر نازیت اور فاشیت نے آ کر اپنے عفریتی پیکر سے اشتراکیت و جمہوریت کی راہ روک لی۔ نازیت اور فاشیت سرمایہ دارانہ شہنشاہیت اور حد سے

زیادہ ظالمانہ قیصریت کی بدترین شکل مہیب ہے۔ مگر آندھیوں کی زد
میں بھی انسانیت و جمہوریت کا چراغ جلتا رہا۔
بولشویک روس نے اشتراکیت کے ساتھ بڑھی ہوئی مادیّت اور
لامذہبیت کو بھی اپنا دستورِ عمل بنا لیا۔ خواہ یہ کلیسائیت کے خلاف
ایک ردِ عمل ہو یا مارکس کی تاریخی مادیت کا نتیجہ۔ اِس روحانی نابینائی
نے خدا ناآشنائی کی رَو کو بہت تقویت دی۔ روس اپنی دُنیا سنوار
اور اپنی عاقبت بگاڑ رہا تھا۔
غرض اقبالؔ کا عہد ایک بُحرانی دَور تھا دُنیا اور اہلِ دُنیا کے لئے
سارے جہان میں ایک خلفشار تھا۔ یہ سیارہ مخالف جماعتوں کی
شورشوں اور اُن کے باہمی پیکار کا ایک میدان کارزار بن گیا تھا۔
کچھ قومیں مٹ رہی تھیں اور نئی ملّتیں اُبھر رہی تھیں۔ ہر طرف جینے
کے لئے لڑائی بھڑائی ہو رہی تھی۔ تنازع للبقا کے ہنگامے
گرم تھے۔ ہر قوم دوسرے کی دُشمن تھی اور حیاتِ ملّی قربانیوں
کا مطالبہ کر رہی تھی۔ کمزور اور ناتوان قوموں کو پُر قوّت و جبر و
قومیں نگل رہی تھیں۔ نازی جرمنی دُنیا کے امن و امان کو آتش و
کے دوزخ میں ڈالنے کے لئے خونیں اسلحے تیّار کرنے کی دُھن
میں پاگل ہوئی جاتی تھی۔ لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) روزِ اوّل
ہی سے کچھ بنیاد تھی۔ اب اس کی رسوائی مکمل ہو گئی۔ چین اور حبش
کا خونِ ناحق ہر چند کہ فاشی جاپان اور فاشی اطالیہ کے دامن

چھڑا ہوا ہے تاہم اس ظلمِ ناروا کا بوجھ لیگ آف نیشنز کے کاندھوں پر بھی ہے۔ دوسری قومیں بھی جرمنی کی جنگی تیاریوں سے گھبرا کر اسلحہ سازی اور ڈپلومیسی بازی کرنے لگیں۔

جنگِ عظیم کے کچھ سالوں کے بعد یورپ اور پھر ساری دُنیا پر اقتصادی، بدحالی، بے روزگاری، کاروباری زوال اور زرعی انحطاط کا منحوس دَور شروع ہوا۔

اقبالؔ کے زمانہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان اور ایشیا کے دوسرے ممالک اپنی سیاسی انفرادیت کے ساتھ اپنی ملی اور اخلاقی انفرادیت بھی کھو چکے تھے۔ مغربیت کا طوفان ایشیا کی خودداری کو بہائے لئے جا رہا تھا مغرب زدگی کا یہ عالم تھا کہ اپنی تہذیب و تمدّن سے نفرت پیدا ہو گئی تھی اور رذائل میں بھی یورپ کی پیروی مبارک و محمود سمجھی جاتی تھی۔ غرض سیاسی، اقتصادی اور ذہنی غلامی کا دَور دَورہ تھا۔ اور خود ایشیائی انحطاط کا یہ عالم تھا کہ مشرق کا قدیم سرمایۂ روحانیت۔ مولویت۔ ملّائیت و سطحی و ناکارہ صوفیّت کے ہاتھوں لُٹ چکا تھا۔ قومی گراوٹ کو خانقاہی پیروں اور حریص مولویوں نے انتہائی تاریک گڑھوں تک پہنچا دیا تھا۔ بے عملی بھوٹی تسکین، بے حسی اور بے حیائی، انتشار و جمود کی منحوس گھٹائیں ہر جگہ منڈلا رہی تھیں۔ ایسی پسپائی کی حالت میں یورپ اپنے عروج و ترقی کی چمک دمک سے نظروں کو خیرہ کر رہا تھا اور مغربی

تعلیم و تعلّم کے ذریعہ مشرق کی ذہنی و اخلاقی غلامی زیادہ تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں یورپ کے محاسن کی روح پیدا نہیں کی جاتی تھی بلکہ بے جان علم کی سطحی نقّاشی مدِّ نظر تھی۔ اِن میں بلند سیرتیں نہیں بنائی جاتی تھیں بلکہ بے عملی کی چلتی پھرتی لاشیں، نوجوانوں میں زندگی کی سمجھ بوجھ کی تخلیق نہیں کی جاتی تھی بلکہ اِنھیں چار پائے بروکتابے چند" بنایا جاتا تھا۔

اس قعرِ مذلّت سے ایشیا کو نکالنے کے لئے مشرق میں نئی تحریکیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ ہر ملک میں آزادی اور وطنیت کا علَم بلند کیا جا رہا تھا۔ مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات پانے کے طریقے بھی سوچے جا رہے تھے۔ ہندوستان کی تحریکوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ایشیا کے دوسرے ممالک میں بھی جاگ پیدا ہو چلی تھی۔ اسلامی ممالک میں بھی بیداری کے آثار تھے۔ مگر عام طور پر یورپ کی پیروی میں وطنیتِ محض پر زور دیا جا رہا تھا۔ تاہم بین الاسلامیت (Pan - Islamism) کی جو رَو جمال الدین افغانی نے چلائی تھی اُس کی موجیں بھی دور دور تک "نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر" پہنچ گئی تھیں۔ اور یورپ و ایشیا کے دوسرے مُفکّرین بھی بین الاقوامیت کا غلغلہ بلند کر رہے تھے۔ اشتراکیت نے اِس غلغلے کو اور بلند آہنگ کر دیا۔

انٹرنیشنل انجمنوں کی تاسیس ہوئی اور وطنیت کے خطرے کے خلاف پُرزور آوازیں اُٹھائی گئیں۔

ساری دُنیا ایک قیامت کے قریب آرہی تھی۔ بحران شروع ہوچکا تھا۔ اب اُس کی انتہائی منزلیں طے ہونے والی تھیں کہ اقبالؔ اِس عالمِ کون و فساد سے چل بسا۔ اقبالؔ کی شاعری اِن سارے مذکورہ واقعاتِ عالم سے متاثر ہوئی اور اُس میں اِس تاثر کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

روایاتِ اُردو شاعری
اور
اقبالؔ کے پیش رو

اُردو شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ولیؔ دکنی سے پہلے کی شاعری تو ابتدائی کوششیں ہیں۔ ولیؔ دکنی سے لے کر غالبؔ سے پہلے تک ایک دور ختم ہوتا ہے۔ غالبؔ خود اور اُس کا گردو پیش دوسرے دور کی تکمیل کرتے ہیں۔ غالبؔ کے بعد اُردو شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اُس تیسرے عہد کی ابتدا آزادؔ اور حالیؔ سے ہوتی ہے اور اقبالؔ اس سلسلے کا خاتم الشعراء ہے۔ اِس کے بعد اقبالؔ کی شریعت شاعری کے پیرو رونما ہوتے ہیں اور اُردو ادب میں تجدید ہوتی رہتی ہے۔ عصرِ جدید کی اُردو شاعری ایک چوتھے دور کو مکمل کرے گی۔ اِس عصر کے میلانات کا بیان خارج از گفتگو ہے۔ صرف اِتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اقبالؔ کی روایاتِ شاعری کا اثر عصرِ نو میں بھی نظر آتا ہے۔

ولیؔ سے لے کر ماقبل غالبؔ کا دور غزلوں، قصیدوں اور مثنویوں کا دور ہے۔ یہ اصناف فارسی کی تتبع میں شروع ہوئی تھیں۔ مگر اِس جسمِ مستعار میں حقیقی روح بہت کم ہی پیدا ہوئی۔ لباسِ شاعری یعنی خارجی ٹکنیک میں جدت رونما نہ ہوسکی۔ مضامین میں بھی بیشتر تصنع اور نقالی کو روا رکھا گیا۔ سچی واردات، اصلی تجربات اور ذاتی جذبات و تخیلات کی کمی ہمیشہ

محسوس ہوتی رہی۔ اساتذۂ فن مثلاً میرؔ، دردؔ، سوزؔ، سوداؔ کی کامیاب کوششیں اور اونچے کارنامے تعداد میں زیادہ نہیں۔ اِن کے تجربات کی دُنیا بھی بہت محدود ہے۔

اِس عہد میں معاشرت کی حالت بہت ہی زار و زبوں تھی۔ ہرسُو انحطاط، پسپائی اور لامرکزیت چھائی ہوئی تھی۔ مُلک کی سیاسی حالت ناقابلِ اعتبار، ہر لحظہ متبدّل اور پریشان کُن تھی۔ اقتصادی اور اخلاقی زوال نے بھی دہلی میں خصوصاً اور سارے ہندوستان میں عموماً ڈیرے ڈال دئے تھے۔ اِس دَور کے شعراء کا اجتماعی تجربہ یاس انگیز تھا۔ اِس مجموعی نااُمیدی نے اُن کی انفرادی زندگیوں کو بھی عموماً تلخ بنا دیا تھا۔ اِن سب باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُن کی شاعری میں بھی اُن کے دل کا درد، اُن کا حُزن و ملال، اُن کی یاس سامانی، اُن کا فرار و گریز صورت نما ہوئے۔ اِس دَور کی شاعری منفیانہ اندازِ نظر کی حامل ہے۔

دوسرے عہد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک درمیانی عہد ہے۔ عہدِ ماقبل کی ساری باتیں موجود ہیں اور کچھ نئی باتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ انگریزوں کی تدریجی ترقی نے مُلک کی حالت کچھ بہتر بنادی تھی۔ نئی تجارت و صنعت نے مُلک میں آہستہ آہستہ قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اِس سے مُلک کا ایک طبقہ تو انگریزوں کے دامن سے وابستہ ہوکر خوش حال ہو رہا تھا لیکن

پرانے شرفا اور رؤسا بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے ہندوستان کا پرانا نظام اقتصاد درہم و برہم ہونے لگا اور نئے نظام نے بہتوں کی ہتھیلیاں بھی بھر دیں۔ انگریزوں کے ساتھ بہت سی برکتیں بھی آئیں اور بہت سی لعنتیں بھی۔ ظاہرا سیاسی مرکزیت اور سطحی سکون کے نیچے ہیجان، بے چینی اور بے اطمینانی کروٹیں بدل رہی تھی۔ ہر چیز مشکوک تھی اور مضطرب۔ اس کیفیت کا نتیجہ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ انقلاب تھی۔ یہ اپنی بد ترتیبی کے لحاظ سے غدر بھی کہلا سکتی ہے اور ایک ہندوستان گیر ذہنی کیفیت کے منطقی نتیجہ کے لحاظ سے اسے ناکام سعیٔ آزادی بھی کہہ سکتے ہیں۔

غالب اُس عہد کا نمائندہ شاعر تھا۔ اُس کی شاعری میں اُمید و نااُمیدی کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اُس کا فلسفۂ حیات تشکیک و تذبذب ہے۔ غالب کی ذہنی کشاکش اس کے عہد کے اضطراب کی آئینہ دار ہے۔

غالب کی شاعری کے اندر ترکیب اظہار (ٹکنیک) میں جدت پیدا کرنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ غالب غلامانہ پیروی کے خلاف بغاوت کرنی چاہتا ہے۔ مگر تنگنائے غزل کی ازلی پابندی میں اُس کی سعی پوری طور پر کامیابی کا مُنہ نہیں دیکھتی۔ غزل بھی ایک خوب صنفِ شاعری بن سکتی ہے مگر ہر تجربہ کے لئے غزل ہی کی ٹکنیک کو برتنا جانِ شاعری کو موت کے

گھاٹ اُتارنا ہے۔ غالب نے معنی آفرینی اور تخلیقِ مضامین میں بھی جدّت و نُدرت سے کام لیا ہے۔ اِس کے تجربات کی دُنیا بھی وسیع تر ہے اور اُس کے یہاں صداقتِ شعری زیادہ پائی جاتی ہے۔

تیسرا عہد اُن نئے میلانات کی تکمیل و اظہار ہے جو غالب کے اندر نظر آتے ہیں اور اُن کے ساتھ نئے تجربوں کا امتزاج بھی نظر آتا ہے۔ غالب کی تمنّائیں زیادہ شاداب ہو کر اِس عصر میں پھولی پھلیں۔ آزاد اور حالی نے اِس دَور کی ابتدا کی۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان باضابطہ انگلستان کی حکومت کے ماتحت ہوگیا۔ مُلک کو امن تو نصیب ہوا مگر بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔ اقتصادی بدحالی ایک حد تک دور ہوئی مگر معیارِ زندگی میں اضافہ ہوگیا اور آرزوئیں بڑھ گئیں۔ فتنہ و فساد دفع ہوا مگر ذہنی غلامی نے ہزاروں نئے فتنوں کی راہ کھول دی۔ سیکڑوں مصیبتوں کے ساتھ اِس عہد کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ انگریزی تعلیم اور اغیار کے عروج کے اثر سے ہندوستان والوں کی آنکھیں کھُلنے لگیں اور طبقۂ وسطیٰ بھی تہذیب و تمدّن، ادب و علم اور سیاست و حکومت میں حصّہ دار بننے لگا۔ انتہائی پستی کے بعد ترقّی کی خواہش میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ بربادی و تباہی کے بعد قوم نے کروٹ لی تھی۔

مایوسی کی جگہ ذلت و نکبت کا گہرا احساس پیدا ہوا۔ حالی اس کیفیت کا نغمہ خواں ہے۔ احساسِ زوال نے اقدام و عمل کی طرف مائل کیا اور رفتہ رفتہ اُمید و یقین کی ٹھنڈی مگر ولولہ خیز نسیم چلنے لگی۔ اِس نسیمِ جاں فزا کی سب سے اہم موج اقبال کی شاعری ہے۔

اِس تیسرے دَور کی شاعری مثبتی ہونے کے ساتھ ساتھ اختراعی بھی ہے۔ نئے (اُریجنل) خیالات و مضامین کے لئے جدید ترکیبِ اظہار (Technique) کی دریافت بھی کی گئی۔ فارسی اصنافِ سخن کی غلامی سے نجات ملی اور نئے نئے انداز کی نظمیں تصنیف ہوئیں۔ انگریزی ادب نے اِس دَور کی شاعری کو بہت متاثر کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جدید تبدیلیاں اِسی تاثر کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔ شعراء کی نظر ہمہ گیر ہوگئی۔ تجربات میں وسعت، بلندی اور گہرائی پیدا ہوئی اور اصلیتِ جذبات اور صداقتِ تخیّلات کی طرف رُجحان پیدا ہوا۔ لیکن اِس دَور میں بھی تصنّع سے مکمل نجات حاصل نہ ہوسکی۔ پہلے ایران کی پیروی تھی اب یورپ کی غلامی ہے۔ اِنے گنے شعراء ہی مصنوعی شاعری سے بلند نظر آتے ہیں اور اِن کی بھی معدودے چند کوششیں کامیاب کہی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی رائے سُنئے۔

"ہندوستان کے اسلامی ادب میں روح کا ملار اعلیٰ کی جانب صعود مرزا غالب کے زمانہ سے بدستور جاری ہے۔ غالب، حالی اور اقبال ایک مقدس اقالیم ثلاثہ کے ارکان ہیں۔ غالب نے اس سکون و جمود کا خاتمہ کر دیا جو انحطاط کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اُس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دئے۔ مگر وہ کوئی غیر معقول متشکک نہیں تھا جسے اپنے شک کی صحت پر بھی یقین نہ ہو۔ اُس کا شک ایک چنگاری تھی جس نے دُنیا میں آگ سی لگادی..........."

"حالی نے جس کے خون میں شعرائے عرب کی سی گرمی تھی، دیکھا کہ دُنیا اپنے ظاہری حُسن و نمائش کے باوجود تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اِس نظارہ نے اُسے بہت متاثر کیا۔ مگر اُس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی۔ اُس نے غم و یاس کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت کی مسرت کا احساس کیا اور اپنے اُستاد (غالب) کی تاخت کردہ عمارت کے کھنڈرات پر ایک نئی دُنیا کی تعمیر کی ٹھانی۔ اور اُسے اپنے سینہ میں نشو و نما دی۔ اُمید کی جھلک نے اُسے نئی زندگی بخشی اور یوں اُس نے تنِ مُردہ میں ایک نئی روح پھونک دی"۔

"اقبال کی شاعری یاس و قنوط کی زنجیروں سے آزاد ہوگئی۔

۳۔ اقبال

اِس نے اُس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور نئی عمارت کو متفاؤلی (Optimistic.) بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ اُس کا نام وعدہ اور بشارت کا مترادف ہے۔ اِس نے زمانۂ حاضرہ کے غیر مُلکی اثر پر قابو پالیا ہے۔ جو فضائے ہند پر چھایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ اُس نے اُس اخلاقی قوّت کی مدد سے کیا ہے جس کا منبع اور مبدار خالص اسلامی ہے۔ اُس کی روحانی تعلیم نے اُس انانیت کو فتح کر لیا ہے جو اِس مادّی دَور کی پیداوار ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

"اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور خود ہی جوان ہوجاتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں وہ زندگی ہے، وہ طاقت ہے جس کے لئے ہماری نئی نسل پُرانے غزل گو شعرا کے دواوین کو بے سُود کھنگالتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا جس نے مُردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دئے ہیں۔۔۔۔۔۔"

اقبال کے مطالعہ کا طریقہ اقبال کی شاعری زندگی بداماں شاعری ہے اور اُس کی اساس و بُنیاد بھی حقائقِ حیات پر قائم ہے۔ اقبال کے تجربات نے اُسے اظہار پر مجبور کیا ہے۔ رسمیہ شاعری سے وہ کوسوں دُور ہے۔ وہ محض شاعر بننے کے لئے بحور و قوافی کو نہیں برتتا بلکہ اُس

کے جذباتی و تخئیلی تجربے اِسی خاص ذریعہ اور ٹکنیک کو اپنی طبعی مناسبت کی وجہ سے اختیار کرتے ہیں۔ اقبالؔ کی شاعری میں ہر جگہ ذاتی مشاہدے کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اُس کی شاعری کوئی ٹھوس اور منجمد چیز نہیں۔ اُس کے اندر ارتقار کی منزلیں ملتی ہیں۔ ایک حقیقی شاعر نقالی اور پیروی کو مُہلک سمجھتا ہے۔ وہ زندگی اور مظاہر زندگی کو خود سمجھنا چاہتا ہے۔ اقبالؔ کا بھی یہی حال ہے۔ لہذا اُس کے خیالات بندھے ٹکے نہیں۔ وہ تدریجاً اُبھرے ہیں۔ اُس کی شاعری کا پودا اپنے اندر عضویاتی نمو (Organic growth) کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اقبالؔ کے خیالات و تصوّرات یک بہ یک پختہ نہیں ہوئے بلکہ وہ اِس طرح ترقّی پذیر ہوئے ہیں جیسے کوئی نخلِ شاداب اپنی ابتدائی حالت سے بڑھ کر ایک گُل پوش اور ثمرور درخت بن جاتا ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں اقبالؔ کی شاعری میں تضاد پاکر بیزار ہوجاتی ہیں حالانکہ یہ تضاد حیاتیاتی ہے۔ شاعرِ مشرق کی عقل و ادراک کا سورج آہستہ آہستہ اوپر چڑھا ہے۔ سپیدۂ سحر اور دوپہر کی سُنہری شعاعوں میں جو فرق ہے وہی فرق اقبالؔ کے ابتدائی احساسات، جذبات، خیالات و تصوّرات میں ہے۔ اُس نے جب بھی زندگی اور کائنات کو جس طرح سمجھا اُسی طرح ایماندارانہ طور پر نہایت پُرخلوص انداز میں پیش کر دیا ہے۔

اقبالؔ کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ نہیں کہ اُس کی شاعری
کے اجزاء کا مطالعہ کر کے ایک رائے عجلت سے قائم کر لی
جائے۔ ہم آپ سبھی اُن چند اندھوں کی کہانی بچپن میں پڑھ یا
سُن چکے ہیں جنھوں نے ایک ہاتھی کے مختلف اعضا کو
چھو کر اپنے اپنے طور پر یہ رائے قائم کر لی تھی کہ ایک ہاتھی
ایک دیوار کی طرح یا ایک ستون کی طرح یا ایک موٹے رسّے
کے مانند یا شاخ کی مثال یا ایک سُوپ کی شباہت کا ہوتا ہے۔
اقبالؔ کی شاعری بھی ایک عظیم الشّان چیز ہے۔ جب تک ہم
کُل کا مطالعہ صبر و سکون اور فراست و ذکاوت سے نہ کریں،
ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہوگا کہ ہم غلطی خوردہ ہیں۔ یہ شاعری
عظیم بھی ہے اور متحرّک، بڑھتی، پھیلتی، پھولتی اور پھلتی
ہوئی بھی۔ یہ زندگی کی تمثیل ہے۔ ''جاوداں، پیہم رواں، ہر دم
جواں''۔ لہٰذا ہماری بصیرت کو بھی ارتقار کی سیڑھیوں پر چڑھ کر
اقبالؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اقبالؔ اپنی بہار اور خزاں
اپنی طاقتوں اور اپنی کمزوریوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا ہے۔
اگر وہ کچھ اور زندہ رہتا تو ارتقار کے چند مزید زینے طے کر لیتا
کیونکہ اُس کا فن کبھی بھی بے جان نہ ہوا۔

اقبالؔ کی شاعری پر ایک نظر

شاعری کی دُنیا بہت وسیع ہوتی ہے۔ ساری کائنات اُس کا

موضوع ہے۔ حیات اپنی ساری وسعتوں، اپنی تمام گہرائیوں، اپنی کل پابندیوں کے ساتھ شاعری کی قلمرو ہے۔ ہر مضمون شاعری کے لئے موزوں ہے۔ مناظرِ فطرت، مظاہرِ قدرت، عشق و محبت، زندگی کی حکمت، معاشرہ کے مسائل، فرد و جماعت کا تعلق، روح کی بقا، تبسم کی مصیبتیں، خودی کے جلوے، انسان اور خدا کا رشتہ وغیرہ سب تجربات، واردات، احساسات و تخیلات فنِ شاعری کے ذریعہ منعکس کئے جا سکتے ہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ جمالیات کے اُصول کی پیروی کرتے ہوئے حسین انداز میں انعکاس ہو۔ پروفیسر فیض احمد فیض کہتے ہیں۔ "شاعری میں ہر مضمون سما سکتا ہے بشرطیکہ شاعر کے ذہن میں اس مضمون کا جذباتی تصور موجود ہو۔ اگر وہ کوئی فلسفیانہ مسئلہ بیان کرے تو وہ مسئلہ اُس کے ذاتی تخیلی تجربہ کی پیداوار ہونا چاہئے۔ نہ کہ کسی خارجی عقلی عقیدہ کی۔ فلسفیانہ شاعری نسبتاً مشکل اسی لئے ہے۔ .... شاعری جذباتی تجربات کو الفاظ کے ذریعہ دوسروں تک پہنچانے کا نام ہے۔ اور اس کی پہلی خوبی یہ ہونا چاہئے کہ اسے پڑھ کر ہم ایک خاص جذباتی فرحت محسوس کریں.... " "جب ہم کوئی اچھا شعر یا اچھی نظم پڑھتے یا سنتے ہیں تو ہمیں ایک قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اگر فلسفہ کا کوئی معقول نظریہ ہماری نظر سے گزرے یا ہم ریاضی کا کوئی مشکل سوال

حل کریں تو بھی ہمیں ایک مختلف قسم کی فرحت میسّر آتی ہے۔ ان دونوں فرحتوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ فلسفہ کے نظریے یا ریاضی کے سوالات ہمیں خالص دماغی فرحت بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن شاعرانہ فرحت پر جذباتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ .... یہ اس لئے کہ شاعر اپنے اشعار کے ذریعہ کوئی جذباتی تجربہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ کچھ دیکھتا ہے، کچھ سُنتا ہے یا کچھ محسوس کرتا ہے۔ اُس کے دل پر ایک جذباتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اُس کے پڑھنے والے بھی اُس کیفیت میں شریک ہوں"۔

پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔ "عالم میں ہر جگہ توازن کی جلوہ گری ہے، تمام اتّفاق کا سرود نظر آتا ہے۔ قوانین عالم گویا کسی حسین رقص پر مبنی ہیں۔ اِسی اتّفاق، توازن، رقص کا نقشہ دُنیائے ادب میں عموماً اور دُنیائے شاعری میں خصوصاً نظر آتا ہے۔ .... شاعری، نقّاشی، مصوّری، موسیقی جملہ فنونِ لطیفہ سے برتر ہے۔ اِس لئے کہ اس کی دُنیا محدود نہیں۔ فضائے عالم کی طرح یہ بھی محیط ہے۔ آئینہ شاعری ہی میں عالم کا مکمل جلوہ منعکس ہوتا ہے۔ .... یہ سائنس اور فلسفہ سے بھی بالاتر ہے۔ .... شاعری گویا نفیس وبیش قیمت تجربات کا حسین، مکمل و موزوں بیان ہے۔ ......

بوقلمونیٔ عالم، نیرنگیٔ جذبات، عالمگیریٔ تخیّل، سحر آفرینیٔ خیالات یہاں سب کی جلوہ گری ہے۔ شاعری محض اِن کی نقل نہیں اُتارتی بلکہ اِنھیں حُسن و صداقت کے سانچے میں ڈھال کر ابدی حُسن وسرمدی صداقت سے مزیّن کرتی ہے"۔.........

"شاعر قوّتِ حاسّہ ازل سے ساتھ لاتا ہے، ایسی قوّت جو صرف ماحول سے چند ناپائدار اثرات ہی قبول نہیں کرتی بلکہ اِن اثرات کو محفوظ رکھ سکتی ہے اور اِنھیں مربوط و مسلسل کرکے صورتِ نَو میں جلوہ گر بھی کر سکتی ہے۔ شاعر کا تخیّل بلند پرواز ہی نہیں دیدۂ بینا بھی رکھتا ہے.........

.......شاعر کسی وارداتِ قلبی، کسی تصوّرِ داخلی، کسی مشاہدۂ خارجی سے متاثر ہوکر اُس کے انکشاف پر مجبور ہوتا ہے لیکن اُس کی نظم تکمیل کے بعد صرف ایک جذبہ یا خیال کی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ مختلف اثرات، جذبات، تفکّرات، نقوش، الفاظ سے مرکّب ہوتی ہے۔ اور یہ کثرت کثرت باقی نہیں رہتی۔ اِس کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ نظم شعرِ مفرد کی طرح صرف ایک خیال، ایک جذبہ کا اظہار نہیں۔ جو تجربہ کسی مختصر اور معمولی نظم میں ملتا ہے وہ بھی چند تجربات کا مجموعہ ہوتا ہے اور اِن میں ربط و تسلسل کا وجود لازمی ہے۔ نظم میں خیالات و جذبات کی ابتدا ترقّی

اور انتہا ہوتی ہے۔ اِن مختلف حصّوں میں ایک فطری ربط ہوتا ہے۔"

"شاعر کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ محض اِن جذبات و خیالات کی ترجمانی پر اکتفا کرے جو اُس نے ذاتی طور پر محسوس کئے ہوں۔ وہ ہر انسانی جذبہ اور خیال کا ترجمان ہو سکتا ہے۔ جذبات ذاتی ہوں یا فرضی وہ اُنھیں شاعری کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے.......جذبات فرضی ہوں یا ذاتی اِن میں جوش کا وجود لازمی ہے۔ ورنہ کامیاب شاعری ممکن نہیں لیکن جوش ایسا نہ ہو کہ شاعر کے قبضۂ اختیار سے باہر نکل جائے۔ شاعر کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ طوفانِ جذبات و تصورات کو قابو میں لا سکے اور اُنھیں پرکھ سکے، تلاطم کو سکون کی شکل میں پیش کر سکے۔ اندر کوہِ آتش فشاں شعلہ زن ہو لیکن سطح پر اتنا سکون ہو کہ حسین پھول کھلتے نظر آئیں۔ لیکن جذبات کا سکون نما جوش کافی نہیں۔ شاعر میں یہ بھی قدرت ہو کہ وہ اُنھیں الفاظ و نقوش و موزونی سے مزیّن کر سکے۔ یہ ضرور ہے کہ شاعر کے دل و دماغ میں پہلے جذبات و خیالات کی موج نمودار ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ الفاظ و نقوش و وزن کی لہر بھی اُٹھتی ہے۔ تجربات اور اُن کے ذریعۂ اظہار میں تعلّق روح و جسد کا ہے، جسم و لباس کا نہیں.....۔"

بقول پروفیسر فضل الرحمٰن۔ "شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں۔ ایک فن، ایک صنّاعی بھی ہے۔ شاعر الفاظ کی مدد سے اپنے حسیات و تخیلات، ولولوں اور اُمنگوں، اپنے تجرباتِ زندگی کو ایک تعمیری عمل کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اِسے زبان میں تناسب، موزونیت اور توازن کا اُسی قدر خیال رکھتا ہوتا ہے جتنا کہ ایک بُت تراش کو مجسمہ بنانے میں۔ اِس لئے درحقیقت عروض و بحور، استعارات و قوافی اور دیگر لوازمِ شاعری اہم ضرور ہیں۔ لیکن یہ سب ذرائع ہیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے۔ راہ کی دلفریبیوں میں اُلجھ کر قبلۂ مطلب کو فراموش کر دینا نادانی ہے۔"

غرض اس گفتگو سے یہ ظاہر ہوا کہ دُنیا کی ساری چیزیں شاعری میں سما سکتی ہیں بشرطیکہ شاعر اُن چیزوں کو خلوص اور جوش کے ساتھ اپنے جذباتی و تخیئلی تجربے میں لے آئے۔ شاعر کے دل اور دماغ سے مَس ہو کر زندگی کا ہر ٹکڑا ایک تخلیقِ نَو کے عمل سے گزرتا ہے اور الفاظ و طرزِ ادا کے واسطے سے نئی زندگی پا کر نمودار ہوتا ہے۔ شعر سے ہم جو فرحت حاصل کرتے ہیں وہ زیادہ حد تک جذباتی ہوتی ہے اور ایک حد تک دماغی۔ دماغی فرحت کا تعلق طرزِ بیان سے ہے اور جذباتی فرحت کا مضمون شعر سے۔ اِن دونوں میں

سے جذباتی فرحت زیادہ ضروری ہے۔ دائمی قیمت مضمون شعر یعنی زندگی کے بنیادی تجربات کو حاصل ہے۔ طرزِ بیان ذریعۂ اظہار ہے۔ مگر عروسِ جمیل کو لباس حریر ہی چاہیئے۔ شاعری ایک تعمیری فن ہے۔ جوشِ جذبات کے سیلاب، تخیل کی اُڑان کو قبضہ میں رکھنا ضروری ہے ورنہ تعمیر میں بدنظمی یا بے راہروی اور افراط و تفریط پیدا ہوجانا یقینی ہے۔ دریا میں سیلاب کا آنا ہرچند کہ فطری عمل ہے لیکن وحشت خیز اور تباہ کن ہے۔ مہذب اور ترقی یافتہ صورت یہ ہے کہ نہریں تعمیر کی جائیں۔ نہر کی فن کارانہ تعمیر سے حسن اور افادیت دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ شاعر کو سیلابِ جذبات کے دھاروں کو فنِ شاعری کی منظم، موزوں، متناسب و متوازن نہروں میں رقصاں ہونے کی تربیت دینی چاہیئے۔ شاعری میں سارے تجربات اپنی خام حالت میں پیش نہیں کردیے جاتے۔ تجربات کا انتخاب ہوتا ہے۔ اُن کی تنظیم و ترتیب، توازن و تزئین کی جاتی ہے اور ان سب کو وحدتِ تاثر کی لڑی میں پرو کر ایک خوبصورت اور بیش قیمت ہار گوندھا جاتا ہے۔ سنگ مرمر کا ہر ٹکڑا تاج محل میں نہیں لگا دیا جاتا۔ ٹکڑوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ پھر اُن کی تراش خراش، تزئین اور ترتیب عمل میں آتی ہے۔ تب کہیں جاکر تناسب، موزونیت اور توازن کا ایک شہکارِ فن وجود میں آتا ہے۔

سارے فنونِ لطیفہ ایک ہی اُصول جمالیات کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی صداقتِ تجربہ اور حُسنِ اظہار۔ تصوّر کی وحدت کثرت میں ربط و سلسلہ پیدا کر کے فن کی تخلیق نو کو ممکن بنا دیتی ہے۔

اِن اُصول کی روشنی میں ہم اقبالؔ کی شاعری کو پرکھیں گے اور اُس کی شاعری کا مقام متعیّن کرتے ہوئے ہم اُس کے خیالات، تصوّرات اور پیام کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

یہ تو اقبالؔ کے عام طالب علم پر بھی ظاہر ہے کہ اقبالؔ کے تجربات کی دُنیا بہت وسیع ہے۔ وہ مناظرِ فطرت۔ انسانی سیرت، قومی کیفیت اور بین الاقوامی مسئلوں سے متاثر ہوا ہے۔ وہ انسانیت اور الوہیت کے تعلّقات کا بھی رازداں ہے۔ غرض اُس کی نظر زمین و زمان اور کون و مکاں پر محیط ہے۔ اقبالؔ اپنی اُفتادِ طبع کے لحاظ سے غائر بین اور حکیمانہ نظر رکھنے والا شخص ہے۔ لہذا اُس کی شاعری بھی فلسفیانہ ہے لیکن فلسفہ نہیں۔ اقبالؔ نے اپنے تجربات کے لئے واسطۂ اظہار شاعری کو بنایا ہے۔ وہ بُنیادی طور پر شاعر ہے۔ فلسفیانہ مسائل حیات اُس کے ذاتی جذبی اور تخئیلی تجربہ کی پیداوار ہیں۔ اُس کی حکمت کے اندر خشک منطقیت نہیں بلکہ وجدان کے جلوے ہیں۔ وہ پہلے دل کو مخاطب یا متاثر کرتا ہے دماغ کو نہیں۔ ادراک اُس کی باتوں سے ایک وجدانی فرحت حاصل کرتا ہے۔ اقبالؔ بہرحال

شاعر ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔ ؎

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اُس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

شانِ خلیل ہوتی ہے اُس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیٔ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

اقبالؔ "نسخۂ زندگیٔ دوام" عطا کرتا ہے اور مثلِ خلیل پیام بھی دیتا ہے مگر اُس کا یہ نسخۂ حیات پہلے خونِ جگر سے تربیت پالیتا ہے یعنی اُس کا ذاتی جذبی و تخیلی تجربہ بن جاتا ہے تب جاکر اُس کی سخنوری کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر کھری باتیں کہتا ہے یعنی وہ صداقت کو پیش کرتا ہے لیکن بہ اندازِ دل نوازی۔ اُس کے کلام میں صداقت کے ساتھ حُسن کا ازدواج ہوتا ہے۔

آئیے پہلے ہم لوگ اقبالؔ کی فطرت نوازی کا مطالعہ کریں۔

اقبالؔ مناظرِ فطرت و مظاہرِ قدرت کی پُکار کو سُنتا ہے۔ خود کہتا ہے ؎

مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

(ایک آرزو)

مناظرِ فطرت اُس کے دل میں جذبات کا طوفان اُٹھاتے اور

اُس کے تخیّل کو مہمیز کرتے ہیں۔ آخر کار وہ اُن مناظر و مظاہر کو منعکس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر وہ اُن کی تخلیق جدید میں کامیاب ہوتا ہے۔ اور اِس طرح اپنے تجربات کو دوسروں تک منتقل کرتا ہے۔ اِس انعکاسِ تجربہ میں عموماً ربط، تنظیم، تسلسل، موزونیت، تناسب و توازن پایا جاتا ہے۔ مگر کہیں کہیں اِس نوع کی نظموں میں بے راہ روی بھی ہے۔ کہیں جذبات زیادہ شور انگیز ہو جاتے ہیں۔ کہیں ربط و سلسلہ قائم نہیں رہتا اور کبھی خیالات کا ارتقار مکمّل نظر نہیں آتا اور گاہ آورد و تصنّع کی جھلک صاف نظر آنے لگتی ہے۔ ملاحظہ ہو بانگِ درا کی پہلی نظم

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں! چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو پاسباں اپنا ہے تو۔ دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اِک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن

چوٹیاں تیری ثریّا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیئے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گُل کی کلی

یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اُسکی خامشی
دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کُنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اِس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیِٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سُنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تو
دَوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو — پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو — سوئے خلوتگاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کُلاہِ مہرِ عالم تاب پر

مُندرجہ بالا بند شاعر نے قصداً لکھا ہے۔ اِس لئے اِن میں آمد اور بیساختگی نہیں۔ کسی خیال یا کسی جذبہ سے مجبور ہو کر شاعر نے یہ نظم نہیں لکھی اِس لیئے اپنی جملہ خوبیوں کے ساتھ بھی یہ کامیاب شاعری کا نمونہ نہیں ہو سکتی"۔ تاہم ہمالہ میں نظم کا بہاؤ اور اُس کے پُرزور الفاظ شاعر کے دل میں ایک جذبہ پیدا کر ہی دیتے ہیں۔ جذبہ سے نظم پیدا نہیں ہوئی بلکہ نظم سے جذبہ پیدا ہوا۔ اِس امر کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ یہ اقبالؔ کی پہلی نظم ہے اور ایک قاری کو اُس کے دامن میں وہ عناصر پلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں

جو آئندہ چل کر پروان چڑھے، ہر ناقد اس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ بلندِ تخیل، جدّت ادا، شوکت الفاظ، نادر تشبیہیں، صداقتِ شاعرانہ کے ساتھ منظر کشی اور فکرِ نکتہ رس یہ سب وہ چیزیں ہیں جو دامنِ دل کھینچ لیتی ہیں۔

"ابرِ کہسار" "ہمالہ" کی طرح "اہتمام و کاوش سے نہیں لکھی گئی ہے۔ نظم کی حیثیت سے کہیں زیادہ کامیاب ہے"۔ ملاحظہ ہو۔

ابرِ کہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابرِ کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا

کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا بحر مرا بن میرا

کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا
ناقۂ شاہدِ رحمت کا حُدی خواں ہونا

غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

بن کے گیسو رُخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

دور سے دیدۂ اُمید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گذر جاتا ہوں

سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جُو آتا ہوں
بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی اُمید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے

سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

اِس نظم میں شعریت موجود ہے۔ ذاتی، جذباتی و تخیلی تجربہ کی بنیاد پر یہ نظم قائم ہے۔ تیسرا بند انفرادی مشاہدہ اور ذاتی تجربہ کا مظہر ہے۔ "اِس میں ایسی روانی اور دل کشی ہے جو دل پر فوراً اثر کرتی ہے"۔ ترنم بھی ہے اور کس قدر دلفریب!" اس طرز کی نظموں میں وہی کامیاب ہیں جن میں تصنع و تکلف نہیں اور کاوش مفقود ہے یا کاوش کو فن کارانہ انداز میں چھپا دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو "ماہِ نو اور موجِ دریا"۔

ماہِ نو

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب؟

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی؟
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؟

قافلہ تیرا رواں بے منت بانگِ درا　　گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آواز پا
گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو　　ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو؟
ساتھ اے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے　　خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بے کل مجھے
نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

موجِ دریا

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بیتاب مجھے　　عینِ ہستی ہے تڑپ صورتِ سیماب مجھے
موج ہے نام مرا بحر ہے پایاب مجھے　　ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے
آب میں مثلِ ہوا جاتا ہے توسن میرا
خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا
میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہ کامل سے　　جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے　　کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

بقول پروفیسر کلیم الدین، ”وہ ان نظموں میں اقبال اپنے موضوع کو روح زندگی عطا کرتے ہیں، پھر زور تخیل سے ان کے دل میں سما کر ان کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں“۔

عموماً اقبالؔ محض منظر نگاری پر قناعت نہیں کرتے۔ اکثر ابر، چاند، تارے کی زبانی یا اُن سے متاثر ہو کر اخلاقی یا فلسفیانہ مضامین کی ترجمانی کرتے ہیں یا مظاہر فطرت میں جان ڈال کر ان کے فرضی جذبات کا شاعرانہ اظہار کرتے ہیں۔

منظر نگاری کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کے یہاں جذبی شاعری کے کامیاب نمونے بھی ملتے ہیں۔ اِس نوع کی نظموں میں منظر نگاری بھی ہے اور ذاتی جذبات کی صورت کشی بھی "ماہِ نو" میں بھی اِس جذبی رنگ کی جھلک موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں آخری دو اشعار۔ اقبالؔ کی یہ منظری و جذبی نظمیں اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ اور ایک اختراع جدید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آزادؔ و اسمٰعیلؔ نے یہ رستہ نکالا تھا لیکن وہ محض ابتدائی مشق تھی۔ اقبالؔ نے صحیح معنوں میں اِس صنعت کو مکمل کیا۔ اگر اقبالؔ کچھ اور نہ بھی لکھتا تو بھی اُردو شاعری میں صرف اِن منظری و جذبی نظموں کی وجہ سے اُس کا پلّہ گراں رہتا۔ عبدالحق صاحب کہتے ہیں۔ "اُن کی بعض چھوٹی نظمیں بہت پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔"

لیکن اقبالؔ کی شہرت کی بِنا اُس کی قومی و ملی نظموں پر قائم ہے۔ آیئے پہلے ہندوستانی وطنیت سے سرشار نظموں کا جائزہ لیا جائے۔ اِس نوع کی نظموں میں "تصویرِ درد" سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یہ وہ دَور ہے جب اقبالؔ کہتا تھا۔

ع   خاکِ وطن کا مجکو ہر ذرہ دیوتا ہے

قومی، ملی یا فلسفیانہ شاعری بہت کٹھن چیز ہے۔ کیونکہ تخئیلی تجربہ کی شکل مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ قومی و ملی شاعری میں تو شاعر خود زبردست، قومی و ملی جذبات سے اس قدر سرشار ہوتا ہے کہ اُن پر اکثر فن کارانہ تنقید نہیں کر سکتا۔ قارئین بھی اِن سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ یہ نہیں دیکھتے کہ اِن کا اظہار شاعرانہ حُسن و صداقت کے ساتھ کیا گیا ہے یا نہیں۔ ”یعنی قومی نظموں میں اِن کا قومی عنصر اِن کے شاعرانہ عنصر سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔“

اقبال اپنی قوم کے دُکھ درد سے واقعی شدید طور پر متاثر تھا۔ اُس کی قومی شاعری رسمی نہیں۔ اُس کے جذبات وخیالات فرضی وخیالی نہیں، ذاتی ہیں اور وہ جوش کے ساتھ محسوس بھی کئے گئے ہیں۔ اِس لئے اِن میں صداقت موجود ہے۔ لیکن شاعرانہ حُسن کی کمی کبھی کبھی ضرور کھٹکتی ہے۔ اُسے خود رعنائی خیال اور صناعت کی کمی کا احساس تھا۔ کہتا ہے۔ ؎

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

اپنی خامیوں کے باوجود اقبال نے قومی شاعری کے میدان میں وہ گُل بوٹے کھلائے ہیں کہ اُن کی نکہت سے مشامِ جاں ہنوز

معطّر ہے۔ ملاحظہ ہو "تصویرِ درد"۔

تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اُٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اُڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دُنیا میں رہنے کا؟
حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گُل ہوں مَیں، خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری

"درین حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
ز فیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم"

ریاضِ دہر میں نا آشنائے بزمِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محرومِ مسرت ہوں
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں
پریشاں ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں؟
نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں
مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں

اثر یہ بھی ہے اک مرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں!
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں؟
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر!
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں!
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پُرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رُلواتا ہے شبنم کو
نرا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو
اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو
شجر ہے فرقہ آرائی، تعصّب ہے ثمر اُس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنّت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اُٹھا جذبۂ خورشید سے اِک برگِ گُل تک بھی
یہ رفعت کی تمنّا ہے کہ لے اُڑتی ہے شبنم کو
پھرا کرتے نہیں مجروحِ اُلفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو
محبّت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

دوا ہر دُکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا
شرابِ بیخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا
یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آبجو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا
شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجکو مست و بے جام و سبو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے، صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے
جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے
وہی اِک حُسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بے ستوں بھی، کوہکن بھی ہے
اُجاڑا ہے تمیزِ ملّت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟
سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے، ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے مُنہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

"نمی گردید کوتہ رشتۂ معنیٰ، رہا کردم
حکایت بود بے پایاں، بخاموشی ادا کردم"

وطن کی خاک کا ذرہ ذرہ مقدس ہے جس گہوارے میں انسان کا "سُنہرا بچپن" "پنپے"، جس آغوش میں اُس کی "رسیلی جوانی" بسر ہو اور جس مُلک کی زمین اُس کی "مُشتِ خاک" کو اپنے سینہ میں چھپالے، اُس کی دل کشی و محبوبی سے کون حساس دل رکھنے والا گریز کر سکتا ہے۔ اقبالؔ کا دل بھی اُلفتِ وطن میں سرشار تھا۔ "تصویرِ درد" کے متعلق عبدالحق صاحب فرماتے ہیں "درحقیقت بے مثل اور سراپا درد ہے"۔

"تصویرِ درد" کے پہلے بند میں جذباتِ وطنیت کا کس قدر شاعرانہ اظہار ہے۔ صرف جذبہ نہیں۔ تخیل اور حسنِ ادا بھی ہے سہ

اُٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اور سہ

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

اِس نظم کے اکثر بند کامیاب ہیں۔ جذبات کا انتخاب، اُن کی ترتیب و تنظیم، تخیل کی حُسن کاری، سلاست و بلاغت، بندش کی چُستی، الفاظ کا رکھ رکھاؤ بالعموم قابلِ تحسین ہے۔ اِس میں وحدتِ اثر پائی جاتی ہے۔ خیال کی مرکزیت قائم ہے اور سارے ذیلی نقوش ایک محور کے گرد رقص کرتے ہیں۔ کثرت میں وحدت ہے۔ مجموعی تاثر بھی بہت گہرا اور دیرپا ہے۔ ابتدا اور انتہا میں ایک ربط ہے۔ "خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری" ابتدا ہے۔ اور سہ سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے، ورنہ

زباں بھی ہے ہمارے مُنہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

کتنا پُراثر اختتام ہے! درمیانی ارتقائے خیال میں کچھ نقص ضرور ہے مگر شاعرانہ استدلال کی روانی اور مجموعی ارتقائے نظم کامیاب ہے۔ بندوں کے درمیان بھی کافی ربط و ضبط پایا جاتا ہے۔

اور بعض مقامات پر یہ ربط بہت خوبصورت ہے۔

"ترانۂ ہندی"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت"، "نیا شوالہ"، "نانک" وغیرہ نظمیں اقبال کی وطنی دوستی کو بہت نمایاں کرتی ہیں۔ "نیا شوالہ" ہندوستان کی نجات کا نغمہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کہتے ہیں۔ "یہ شاعر کے انتہائے کمال کا نمونہ ہے۔ اس کے ہر شعر میں حبِ وطن کی

آگ بھری ہوئی ہے"۔ یہ چھوٹی سی نظم بہت ہی خوبصورت پارۂ فن ہے۔ خیال، جذبہ، تخیل، ندرتِ ادا، لطیف زورِ بیان، درد، پیامِ عمل ایک ذہنی پُر اُمید سکون، پاکیزگی اور پیمبرانہ بلندی سب شاعرانہ ہم آہنگی و تناسب کے ساتھ صورت پذیر ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی متحدہ ترقی پسند قومیت اور ایک صحیح ہندوستانی زبان کا تصور اور اُن کی صورت کشی اِس نظم میں موجود ہے۔ ع

دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

"نیا شوالہ" کے برخلاف "نانک" میں صداقت موجود ہے مگر جوش اور صداقت کا شاعرانہ اظہار مفقود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نانک

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی!

آہ! بد قسمت رہے آوازِ حق سے بیخبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی، لیکن زمیں قابل نہ تھی!

آہ! شودر کے لئے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بُتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے!

وطنیت کے بعد اقبالؔ کی دوسری منزل اسلامیت یا بین الاقوامیت ہے۔ یہ تضاد نہیں ترقی ہے۔ تنگ نظر قومیت کی ہلاکت آفرینی کو اقبالؔ نے اچھی طرح محسوس کیا اور انسانیت کی نجات بین الملیت میں تلاش کی۔ "نیا شوالہ" ہی میں اِس تصور کی ابتدا پائی جاتی ہے۔ وہ صرف ہندوستان کے باسیوں کی ہی مُکتی پریت میں نہیں ڈھونڈھتا بلکہ کہتا ہے۔ ع

دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے۔ شاعر کی ہمدردی دھرتی کی گود کی طرح وسیع ہے۔ وہ سب کو اپنا سمجھتا ہے۔ ہاں انسانی اُخوت کے حصول کا ذریعہ وہ "اسلامیت" کو قرار دیتا ہے۔ ~~~ ۵

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے   غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

اقبالؔ ڈاکٹر نکلسن کو خط لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے "مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن بہ اعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے اُن کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اِسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں

کو اپنا مخاطبِ اوّلین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو۔ لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اِس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے"۔ اقبالؔ کے نزدیک مُسلم کا "حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے"۔ وہ کہتا ہے کہ نسل اور حدودِ مُلک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اُسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اِسے انسانی قوتِ عمل کا مظہرِ اتم سمجھ لیا جائے"۔

اقبالؔ کی مِلّی شاعری ایک شاندار شاعری ہے۔ اِس کے نمونے بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم نیز ارمغانِ حجاز میں ملتے ہیں۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق اور ہر سہ کتاب کی بہت سی نظمیں اِسی قبیل کی چیزیں ہیں "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" میں اقبالؔ کا مکمل تصورِ مِلّی سامنے آجاتا ہے۔ لہذا اِن کا جائزہ لینا کافی ہوگا۔

"خضرِ راہ" کی ظاہری صورت مکالمہ کی ہے۔ شاعر مختلف مسئلوں کے متعلق خضر سے سوالات کرتا ہے اور خضر اُن کے جوابات دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

خضرِ راہ

شاعر

ساحلِ دریا پہ میں اِک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اِک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب!
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب!
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضَو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب!
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب!
دل میں یہ سُن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
"کشتیِ مسکین" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش!
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ ناؤ نوش!
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ!
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش!
آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

جوابِ خضر

صحرا نوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل!
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل!
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل!
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل!
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل!
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل!

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی!

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی!
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی!
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی!
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوّتِ تسخیر سے
گرچہ اِک مٹّی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پُختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو!

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوّتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے!
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ المُلُوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری
سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بیہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بُتانِ آذری
از غلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی سازِ کُہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری!
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اِک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری!

اِس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو!

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات!
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات!
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات!
ساحرِ اَلموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اُسے شاخِ نبات!
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چُن چُن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے!

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک!

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گُل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک؟

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

دُنیائے اسلام

کیا سُناتا ہے مجھے تُرک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز!
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستان سے پارس
وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہوگیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند؟
"ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں"
حق ترا چشمے عطا کردست غافل درنگر!
مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر
ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
مُلک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اِک ثمر
ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مِٹ جائے گا
تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گُہر!
نسل اگر مُسلم کی مذہب پر مقدّم ہوگئی
اُڑ گیا دُنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر!
تا خلافت کی بِنا دُنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر
اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہُشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہُشیار باش!
عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ!
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ!
عامِ حرّیت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اِس خواب کی تعبیر دیکھ!

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ!
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ!
مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

اِس نظم میں خیالات کی ابتدا، اِن کی ترقّی اور انتہا بہت فن کارانہ طور پر پیش کی گئی ہے۔ ایک بند دوسرے بند سے مربوط ہے اور اکثر بندوں کے اندر بھی ربط اور ارتقائے خیال پایا جاتا ہے۔ لیکن بعض بند میں ربط و تسلسل کامل نہیں۔ خیالات پُر جوش اور ولولہ انگیز ہیں۔ پہلا بند شاعری کا بہت ہی حسین نمونہ ہے۔ "شاعر آغازِ نظم میں عقبی زمین پیش کرتا ہے"۔ خیالات و جذبات کے تلاطم میں شاعرانہ تہذیب و تربیت نظر آتی ہے۔ بہت ہی لطیف و نفیس انداز میں منظر کی بولتی ہوئی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ہر چیز واضح اور شفاف ہے۔ ایک تابان آئینہ کی مثال "ساحلِ دریا" سکوت۔ طلسمِ ماہتاب۔ انجمِ کم ضو۔ رات کا افسوں۔

تصویرِ آب۔ پھر شاعر کا وجودِ تنہا اور ایسے میں جہانِ پیما خضر کا ڈرامائی انداز میں نمودار ہونا۔ یہ سب نقوش زندگی بداماں نظر آتے ہیں۔ حروف، الفاظ و اصوات بھی اس خاص فضا کے لئے بہت ہی موزون و مناسب ہیں۔ منظر کی گھلاوٹ اور پُرسکون خواب آوری پیدا کرنے میں نرم اور کھنچی ہوئی آوازیں بہت ہی ممد ہوتی ہیں۔ مثلاً "سا"۔ "یا"۔ "اے"۔ "راب"۔ "آب"۔ "کو"۔ "سو"۔ "سیر" وغیرہ۔ مگر جب خضر نمودار ہوتے ہیں تو شاعر کے چونک اُٹھنے سے اصوات کی خواب آوری بھی کم ہونے لگتی ہے۔

پہلے بند کے اشعار بے حد حسین ہیں۔ مگر نظم میں ہر جگہ خیالات و جذبات کے اظہار میں شعریت یکساں نہیں۔ "جیسے جیسے خیالات کا عمق اور جذبات کا جوش و خروش ترقی پذیر ہوتا ہے اسی قدر شاعرانہ حُسن کی طرف سے بے توجہی بڑھتی جاتی ہے۔" مگر اقبال کا خاص رنگ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ خیالات کی فلسفیانہ گہرائی، صداقتِ تجربہ، جوش، بے پناہ زور، طرزِ ادا کی شان و شوکت اور تاثیر کہاں نہیں۔ اور یہی حال اقبال کی اکثر نظموں کا ہے۔ اقبال کا طرز ہر مقام پر نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتا ہے۔

"خضرِ راہ" کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی دُنیا صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ اُس کی نظر سارے

انسانی مسائل پر حاوی ہے۔ زندگی کی نوعیت، عمل کی اہمیت، آزادی کی قیمت، سلطنت، جمہوریت، سرمایہ اور محنت اِن سب مسئلوں کے ساتھ ساتھ وہ دُنیائے اسلام کی خاص گتھیوں کو بھی سُلجھانا چاہتا ہے۔

اقبالؔ کی رگ رگ میں اسلامی خون موجزن تھا۔ لیکن وہ اسلام کو انسانیتِ عظمیٰ کی نجات کا ذریعہ نہایت ہی خلوص کے ساتھ سمجھتا تھا۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ ـــــــ "اُن کا حسّاس دل مسلمانوں کے تنزّل کا نقشہ دیکھ کر بے چین ہو گیا .... لیکن اُن کا مطمحِ نظر بہت وسیع تھا۔ اُن کی آنکھیں ہندوستان کے حدود ہی کے اندر نگراں نہ تھیں بلکہ کُل انسانی دُنیا کی عموماً اور اسلامی دُنیا کی خصوصاً نظّارہ کناں تھیں .... وہ تہذیبِ حاضر کے طلسم کے تباہ کُن اثر سے واقف تھے اور اِسے اپنے سحر آفریں افکار سے باطل کرنا چاہتے تھے۔ "ضربِ کلیمؔ" میں دَورِ حاضر کے خلاف باضابطہ اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔ لیکن یہ اعلانِ جنگ تو آغاز ہی سے اِن کی نظموں میں مستور تھا۔ تنزّلِ حال، عروجِ گذشتہ، بشارتِ مستقبل۔ یہی اقبالؔ کی شاعری کا سنگِ بُنیاد ہیں۔

.... اقبالؔ کا مطمحِ نظر ہی صرف وسیع نہ تھا، اِن کا دماغ بھی بلند پایہ تھا، اِس لئے اِنھوں نے بلند و عمیق خیالات

کو داخل کرکے قومی و ملی شاعری کی فضا ہی بدل دی۔ ....
اِس میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ اقبالؔ اُردو میں بہترین قومی و ملی شاعر ہیں۔"

اقبال "طلوعِ اسلام" میں تنزلِ حال کے باوجود ملتِ اسلامیہ کو ایک شاندار مستقبل کی بشارت دیتا ہے۔ جنگِ عظیم میں تُرکوں کی شکست، شریفِ مکہ کی غداری، ممالکِ اسلامیہ کی پسپائی۔ یہ واقعات خون کے آنسو رُلانے والے تھے۔ مگر یونانیوں کے مقابلہ میں "جوانانِ تتاری" کی شاندار فتح نے اقبالؔ کے دل کو اُمنگوں اور اُمیدوں سے بھر دیا اور وہ نغمہ پیرا ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

طلوعِ اسلام

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی!
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دَوڑا
سمجھ سکتے نہیں اِس راز کو سینا و فارابی!
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نُطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"
تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جُدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی!
ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے
سرشکِ چشمِ مُسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہُر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!
ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گُل سے اپنا ہم سفر پیدا!
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا!
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے!
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے!
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے!
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے!

جہانِ آب و گِل سے عالَمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے!
یہ نکتہ سرگزشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا
یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اُخوّت کی جہانگیری محبّت کی فراوانی!
بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گُم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی!
میانِ شاخساراں صحبتِ مُرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی!
گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی!
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی!
ہوئے احرارِ ملّت جادہ پیما کس تجمّل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی!

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دُنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اِس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا!
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری،
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اِک نُکتۂ ایماں کی تفسیریں!
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّہ کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبّت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے!

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے!

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے!

غبارِ رہگذر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے!

ہمارا نرم رُو قاصد پیامِ زندگی لایا!
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے!

حرم رُسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے!

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر پایندہ تر تابندہ تر نکلے!

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے!

تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اُخوّت کا بیاں ہو جا محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پَر فشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبّت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گُلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبّت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی!
ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے!

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے!
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبّت کی
زمیں جولانگہ اطلس قبایانِ تتاری ہے!
بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
"پس از مدت گذار افتاد برما کاروانے را"
بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد!
کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد!

سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں سازدہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد!
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد!
بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد!
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نمناک میگردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد!
سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہالِ ملتِ ما سازگار آمد!
"بیا تا گُل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم"

اِس نظم میں جوش و ولولہ "خضرِ راہ" سے زیادہ ہے۔
تنِ مُردہ میں جان پڑ جاتی ہے اور دل اُمیدوں اور جذبۂ عمل سے لبریز ہو جاتا ہے۔ علوئے تخیّل، زورِ بیان، شوکت و جلال، جمیل استعارات، جلیل تشبیہیں، حسین تراکیب، خوبصورت اندازِ بیان، پیمبرانہ ایقان و ایمان اور شاعرانہ مستی و سکون۔ جذب و سرشاری۔ یہ سب محاسن اپنے اپنے جلوے دکھاتے ہیں۔ ؎
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے!

اور یہ نادر شعر ؎

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

کیسی چمکتی ہوئی تصویر کشی ہے۔ غیر مرئی حقیقت کو اُجاگر کرنے کا کتنا فن کارانہ طریقہ ہے۔ اسے کہتے ہیں حُسنِ محاکات۔

یہ بند جو اِس مصرعہ سے شروع ہوتا ہے۔ ع

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے

کتنا مترنّم، متوازن، جذبہ و تخیّل سے ہم آغوش، جدّتِ ادا اور تخلیقِ نَو کا حامل، خطیبانہ پیام کی نثریت سے بَری اور شاعرانہ صداقت و تاثیر کا سرمایہ دار ہے!

"طلوعِ اسلام" کے بہت سے شیوہ ہائے حُسن کے باوجود بندوں کے اندر اور بندوں کا آپس میں میل کامل نہیں۔ نظم میں ربط اور عضویاتی ارتقاء ہر جگہ نظر نہیں آتا اور کہیں ارتقائے خیال ہے بھی تو میکانکی ہے اور کہیں خیالات میں غزلیت پائی جاتی ہے۔ غالباً یہ نقص شاعر کی جذباتی ربودگی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ مگر سب سے بڑی خامی ایک دو مقامات پر اندازِ بیان کی نثریت میں نمودار ہوئی ہے۔ شاعر کا تجربہ شاعرانہ صورت اختیار نہ کرسکا اور خونِ دل سے ملے بغیر اشعار میں منعکس ہوگیا۔ اِن مقامات میں پیام پہنچانے کی عجلت نے شاعر کو محض خطیب و نقیب

بنادیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

اور ؎

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ان اشعار کا مقابلہ کیجیئے اس شعر سے تو فرق ظاہر ہوگا۔ ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

"تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات، لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ (اقبال کے) کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔ وہ گویا مرزا کے معنوی شاگرد ہیں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن بندش میں وہ چُستی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ مرزا کے طرزِ ادا میں جو خاص نزاکت ہے وہ نہیں پائی جاتی ہے اور نہ وہ سوز و گداز و درد ہے جو ہم حالی کے کلام میں پاتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں تکلف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں مگر شان و شکوہ۔ زور اور شور اُمنڈتے ہیں۔ جذبات کی ادائی، حکیمانہ

نظر اور شاعرانہ انداز بیان میں اقبال کے کلام کا جواب نہیں"۔

[تنقیدات عبد الحق صفحات نمبر ۷۷، ۷۸]

بہرحال محاسن و معائب پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے مجموعی طور پر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ عیب بہت ہی کم ہے اور ہنر بیشمار۔ اور اگر ایشیائی رقص و وجد اور پیام کی گرانباری کا لحاظ رکھا جائے تو پھر عیوب اُس کی شاعری کی خوبصورت افادیت کی جلوہ باریوں کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اقبال اپنے نظریۂ فن کے ماتحت جن عناصر کو بُنیادی سمجھتا ہے وہ اجزا ہمیشہ اُس کی شاعری میں موجود رہتے ہیں۔ وہ خود کہتا ہے۔ ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

مقصودِ ہُنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا!

غرض اقبالؔ کا نظریۂ فن نہایت ہی ترقی پسند اور انقلابی واقع ہوا ہے۔ اقبالؔ کو اس امر میں بھی اوّلیت حاصل ہے۔ پروفیسر غلام سرور ایم۔ اے (لکچرار شعبۂ انگریزی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) فرماتے ہیں کہ "اقبالؔ کی شاعری کو معجزے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے"۔ اور پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ اقبالؔ نے واقعی ایک ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔ یہ تھی اُس کی ضربِ کلیمی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ بعض زمانے ایسے ہوتے ہیں جب سب معیاروں سے بڑا معیار آزادیٔ انسانی کا صور پھونکنا اور استحصالی قوّتوں کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ ایسے وقت میں فن کو جمال سے زیادہ جلال کی حاجت ہوتی ہے۔ "طاؤس و رباب" کی نہیں "شمشیر و سنان کی"۔ اقبالؔ کا زمانہ ایسا ہی تھا اور اقبالؔ کا فن مطالباتِ عصر کو اچھّی طرح پورا کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کی شاعری کو بھی ترقی پسندی اور انقلاب انگیزی میں اقبالؔ ہی کی پیروی کرنی چاہیئے۔ وہ اِس عہد کا سالارِ کارواں ہے۔

فلسفۂ خودی

"طلوعِ اسلام" میں اقبالؔ کے فلسفہ کا مرکزی تصوّر بھی پیش ہوا ہے یعنی نظریۂ خودی۔ خودی کیا ہے؟ خودی، روح، ذہن، ادراک، قلب اور ارادہ و شعورِ انسانی کی مکمل جلوہ نمائی ہے۔ فرد کے سارے ممکنات کا اظہار ہے۔ اس کی ساری فطری و اکتسابی صلاحیتوں کی نمائش

ہے۔ افراد کی خودی جب مل جاتی ہے تو اِس اجتماع و اتحاد سے
جماعت کی خودی پیدا ہوتی ہے اور یہ خودی قوی تر شئے ہے۔
فرد کی خودی کو جماعت کی خودی میں مدغم ہو جانا چاہیئے کہ یہی صحیح
راستہ ہے ارتقائے خودی کا۔ گویا مرد میں خودی اور بیخودی دونوں کی
صلاحیتیں ہونی چاہئیں۔ خودی "دو" طرح کی ہوتی ہے۔ ایک
خودیٔ صالح اور دوسری غیر صالح۔ اقبال خود اپنے ایک خط میں لکھتا
ہے۔ "خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانونِ الٰہی کی پابند
ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض
جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے
عروج کے زمانہ میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اِس قدر
ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری
صورت میں قانونِ الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہرحال حدودِ
خودی کے تعین کا نام شریعت ہے"۔ جرمنی کا مفکر نطشے خودی
کی تکمیل کا خواب ایک ایسے فوق البشر کی صورت میں دیکھتا ہے
جو قوت و شوکت کا دیوتا ہو۔ اُس کے نزدیک قانون صرف ایک
ہونا چاہیئے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ وہ نرمی اور مروّت کا قائل
نہیں۔ نطشے کے خواب کی تعبیر خود ہٹلر ہے، راون کا اوتار۔
ایک زور و قوت راون میں تھی اور ایک طاقت و جبروت رام
میں۔ ایک عنتر تھا اور ایک حیدر۔ ایک طرف عتبہ و شیبہ اور

دوسری جانب حمزہ ۔ فرق یہ ہے کہ راون، عنتر، شیبہ و عتبہ میں صرف جلال و جبروت پایا جاتا تھا لیکن رام، حیدر اور حمزہ میں جلال و جمال کا خوبصورت امتزاج تھا۔ طاقت کے ساتھ نرمی، مروت، عفو و حلم بھی۔ "طلوعِ اسلام" میں اقبال کہتا ہے۔ ؎

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

جبر و ظلم کے سامنے جری اور جنگ آزما۔ ہمدردی و موالات کی فضا میں حلیم و شفیق ۔ "کوہ و بیابان" ہو تو "سیلِ تند رو" اور "گلستاں" ہو تو "جوئے نغمہ خواں"۔ یہی ہے اخلاقِ خودی۔ اقبال اپنے قول و تحریر کے مطابق نطشہ سے سخت اختلاف رکھتا ہے۔ اقبال نکلسن کے نام کے خط میں لکھتا ہے۔ "وہ نطشہ بقائے شخصی کا منکر ہے .... بخلاف اُس کے میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو ہے......" گویا اجتماعیت میں انفرادیت کے لئے بھی جگہ ہے۔

اقبال جمہوریت کا قائل ہے لیکن وہ مغرب کے جمہوری نظام

کی منافقت کو خوب سمجھتا ہے۔ "خضرِ راہ" میں کہتا ہے کہ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام

جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اقبالؔ فاشیت اور نازیت کے عروج سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ مسولینی اور ہٹلر کے ذوقِ عمل اور جدتِ کردار کا قائل تھا۔ مسولینی کی تعریف میں ایک نظم "بالِ جبریل" میں لکھی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اقبالؔ مسولینی سے زیادہ اس کے "ندرتِ فکر و عمل" سے متاثر تھا۔ اسی طرح اقبالؔ ابلیس کے "ندرتِ فکر و عمل" سے بھی متاثر رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ عمل اور جدتِ کردار کو بہر حال بے عملی اور فرسودگی پر ترجیح دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو بالِ جبریل کی نظم "جبریل و ابلیس"۔ ابلیس کہتا ہے ؎

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو

مگر اقبالؔ کا حقیقی پیغام یہ ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اور ع "تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے"۔ "خضرِ راہ" میں "سرمایہ و محنت" پر خضر کی زبانی اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ؎

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش

قصۂ خوابِ آورِ اسکندر و جم کب تلک!

وہ مزدور کو یوں پیغام دیتا ہے۔ سے

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال ایک نئی جمہوریتِ انسانی، ایک نئے آسمان و زمین، ایک نئی جنت کی نوید بتا دیتا ہے۔ سے

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام

دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک!

اقبال فاشیت اور نازیت کا سخت مخالف تھا۔ وہ اشتراکیت کے جمہوری اُصول اور مساوات کو پسند کرتا تھا لیکن اُس کی مادیت اور خدا ناآشنائی سے بیزار تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال "اشتراکیت اسلامی" کا نغمہ سنج تھا۔ ملاحظہ ہو بال جبریل کی نظمیں "لینن"، "فرشتوں کا گیت"، "فرمانِ خدا" اور "ضربِ کلیم" کا باب "سیاسیاتِ مشرق و مغرب"۔

اقبال کی غزلیں ٹیگور سے مماثلت و مغائرت

اقبال نے غزلوں ہی سے ابتدا کی تھی۔ اور اُس نے نظموں کے ساتھ ساتھ ترازوئے غزل کا پلّہ بھی گراں کر دیا۔ غزلیں بانگِ درا سے شروع ہوتی ہیں مگر یہ

اپنے انتہائی عروج پر بالِ جبریل میں پہنچی ہیں۔ اقبالؔ کی غزلوں کی ایک نئی انفرادی شان ہے۔ یوں تو اقبالؔ کی غزلوں میں عام فلسفیانہ، سیاسی، ملّی و اخلاقی مضامین بھی پائے جاتے ہیں مگر اُن کی اصلی خصوصیت خاص الخاص رنگ کے عشقیہ تجربات میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ عشق محدود نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ اس کا جذب و مستی، سوز و ساز، درد و کیف کائنات و ماورائے کائنات تک وسیع ہے۔ یہ جذباتی تجربات حُسنِ مطلق کے جلوہ ہائے صد رنگ سے وابستہ ہیں۔ اس نوع کے تغزل کو صوفیانہ شاعری سے صرف سطحی مشابہت حاصل ہے۔ یہ بلندیٔ ذوق و نظر میں بالکل منفرد ہے۔ فارسی یا اُردو کی رسمیہ صوفیانہ غزلیں بالِ جبریل کی غزلوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اپنے علو، اپنی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے اقبالؔ کی عشقیہ شاعری ٹیگور کی گیتان جلی سے زیادہ قریب ہے۔ دونوں میں اندازِ نظر کا فرق ضرور پایا جاتا ہے ٹیگور میں ربودگی و سپردگی ہے اور اقبالؔ میں محبت کی پیدا کردہ شوقی، اقدام اور پندار ہے۔ گیتان جلی میں گداز ہے، گھلاوٹ اور سوز و ساز ہے۔ بالِ جبریل کی غزلوں میں اضطراب، بیتابی اور شعلہ بداماں ہے۔ ٹیگور کے عشق میں نسائیت ہے اور اقبالؔ کی محبت میں مردانہ پن۔ ایک میں جمال نمایاں ہے اور دوسرے میں جلال مگر بالِ جبریل کی غزلوں میں مردانہ کھردراپن نہیں بیباکی

ہے مگر نفاست کے ساتھ خودداری ہے مگر سرشاری کے ہم پہلو۔
بانگِ درا کی غزلوں میں اُن خصوصیات کا آغاز ہے جو
بالِ جبریل میں پختہ ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ غزلیں۔

پردہ چہرے سے اٹھا، انجمن آرائی کر
چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر

تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کب تک؟
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر

نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم!
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

ہو تری خاک کے ہر ذرہ سے تعمیرِ حرم
دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

پہلے خوددار تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبالؔ
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

۷۔ اقبال

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں
دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ "وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

بالِ جبریل کی نظموں میں معنویت کی بلندی کے علاوہ طرزِ ادا
اور تعمیر کی ہم آہنگی زیادہ فن کارانہ ہے۔ غزل کی بے ربطی اور بے ترتیبی
کو پیش کر کے صنفِ غزل کو "نیم وحشی" کہنے والے ناقد موجود ہیں۔
مگر میں غزل کو ایک اختصاصی قماش کا فن تصور کرتا ہوں۔ اس کی
'ڈیزائن' اور 'پیٹرن' میں میکانکی اور سطحی بے ربطی ضرور ہوتی ہے

لیکن اس میں داخلی ربط اور لگاؤ پایا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض ناقص غزلوں میں داخلی ربط بھی اشعار کے درمیان نہیں ہوتا لیکن اس نقص کے سبب صنفِ غزل کو مردود ٹھہرانا غلط ہے۔ اچھی غزلوں میں داخلی ربط ضرور ہوتا ہے اور اقبالؔ کی کامیاب غزلوں میں تو لطیف ارتقائے خیال کی جھلک بھی موجود ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے!
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے!

نہ کردیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے!

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے!

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے!

کہیں اُس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے!

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے!
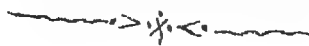
تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ!
یہ بُتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ!
نہیں اس کھُلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے! نہ قفس نہ آشیانہ!
رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ!
مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے!
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ!
مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ!
تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ!

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں!
عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اِس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داریہائے شوق!
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں!

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجکو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مُرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گُل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صُبح
اور چمکاتی ہے اِس موتی کو سورج کی کرن
حُسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھّے کہ بن؟
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

من کی دُنیا! من کی دُنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دُنیا؟ تن کی دُنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن!
من کی دُنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دُنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جُھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری!
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمھارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری
سُنے نہ ساقیٔ مہوش تو اور بھی اچھا
عیارِ گرمیٔ صحبت ہے حرفِ معذوری
حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عینِ مستوری!

وہ ملتفت ہوں تو کُنجِ قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحنِ چمن بھی مقامِ مجبوری
بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اِسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری!

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے!
مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گُل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے
رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے!
نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے!
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے
ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اِسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

مرے گلو میں ہے اِک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے!

زندگی میں تنظیم، اجتماعی تعمیر، ربط و تسلسل، ترتیب و ارتقاء کے ہم پہلو تھوڑی سی آزاد خیال پروری، انفرادی من کی موج، ترنگ، غیر منظم جذب و مستی بھی پائی جاتی ہے۔ انسان مشین نہیں۔ اِسی طرح آرٹ میں بھی اگر ایک دو صنفیں ایسی ہوں جن میں تنظیم و تسلسل کی جگہ آزاد من کی موج کا اظہار ہو تو کیا اُسے وحشی صنف کہیں گے؟ ہرگز نہیں۔ ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

غزل آزاد رَو اور چھوٹے چھوٹے لکّہ ہائے ابر کی طرح ہے جو "آبِ رکنا باد" یا گنگ و جمن پر اپنے حسین سائے ایک دلپذیر بے ترتیبی کے ساتھ ڈالتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ غزل ایک مخصوص کیفیت کی پیداوار ہوتی ہے اور ایک خاص "پیٹرن" کے ذریعہ اِس کیفیت کا اظہار و انعکاس ہوتا ہے۔

اقبال کی چھوٹی چھوٹی نظمیں

اقبال نے چھوٹی چھوٹی نظموں کی تخلیق "بالِ جبریل" ہی سے کرنی شروع کی تھی۔ "ضربِ کلیم" میں اکثر نظمیں اِسی نوع کی ہیں۔ اِن نظموں کی صورتِ تعمیر قطعات کی طرح ہے۔ بعض میں غزل

کی صورت مطلع کے استعمال سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اِن حسین نظموں میں اقبال اپنے مخصوص خیال و تصور کو ایجاز و اختصار کے ساتھ اکثر شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ مگر کبھی پیام کی گرمی نثریت پیدا کر دیتی ہے۔ "ضربِ کلیم" میں نثریت غالب ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

تری دُنیا جہانِ مُرغ و ماہی مری دُنیا فغانِ صبح گاہی
تری دُنیا میں مَیں محکوم و مجبور مری دُنیا میں تیری پادشاہی
(بالِ جبریل)

اس کے مقابلہ میں "ضربِ کلیم" کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

اِس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف!
فطرتِ افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں مِلّت کے گناہوں کو معاف

"ضربِ کلیم" میں نظمیں "بالِ جبریل" کی چھوٹی نظموں سے نسبتاً بڑی بھی ہیں۔ ساری "ضربِ کلیم" مغربی مادیت اور مشرقی مُلّائیت کے خلاف اعلانِ جہاد ہے۔ اِس رزم میں چھوٹے چھوٹے خنجر استعمال ہوئے ہیں۔ اصیل و برّاں اِس طرز کی نظمیں چمکتے ہوئے ہیرے کی طرح ہیں۔ شدید و گراں قدر۔ لیکن بعض شاعرانہ لحاظ سے ناتراشیدہ ہیں۔ یہ نظمیں گویا ذہنی گولیاں ہیں جن میں تریاق بھرا ہے۔ مریضانہ مشرقیت اور مجنونانہ مغربیت کے دفعیہ کے لئے۔

کہیں کہیں تشخیص مرض غلط بھی ہے۔ لہذا دوا بے اثر۔ مشرق و مغرب میں زہر کا داخلہ سب سے پہلے گمراہ کن تعلیم و تربیت کے ذریعہ ذہن و روح میں ہوتا ہے۔ اقبال کا علاج ملاحظہ ہو ؎

ہندی مکتب

اقبال! یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات!
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات!
آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات!
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات!
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات!

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ!

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ۔

مدرسہ

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش!

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش!

اُس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش!

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفّاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش!

اساتذہ

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو!
دُنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو!
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعوٰئے نظر لاف و گزاف

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف!
اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف!
فطرتِ افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف!

اِن میں اکبر الہ آبادی کا اثر پایا جاتا ہے۔ طرز میں نہیں تصوّر میں۔ کالجوں، طلبار اور معلّمین مغرب زدہ پر اکبر نے طنز کے خوب خوب نشتر چلائے ہیں۔

اقبال کے اثرات اُردو شاعری پر اور اُس کے معاصرین

اقبال اُن شعراء میں سے تھا جو زمانے کی رَو کو بدل دیتے ہیں۔ اِن کی شاعری کا زبردست اثر اور قوتِ نفوذ۔ روایاتِ ادب میں ایک لافانی جگہ بنالیتی ہے۔ اقبال کی شاعری نے نہ صرف بُت شکنی کی بلکہ اُس نے نیا حرم بھی تعمیر کیا۔ اِس جدید قبلۂ شعر کی طرف رُخ کرنے والے بکثرت پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اقبال کی اُمت بہت بڑی ہے اور ابدی۔ اِس کی مجدّدانہ شاعری نے شعراء کو پیروی اور تجربات کی کم نگہی سے آزاد کیا اور اِس طرح ادراک و تخیل کا اُفق وسیع تر ہو کر نئے نئے تجربات کے لئے

راہیں کھُل گئیں ۔

چکبست پر انیس اور اقبال کا متحدہ اثر ہے ۔ حفیظ جالندھری کی شاعری کے محرک اقبال کے تصورات ہیں ۔ سیماب اکبر آبادی اور عظیم عظیم آبادی کی شاعری میں بھی اقبال کی آواز سُنائی دیتی ہے ۔ علامۂ عظیم عظیم آبادی نے تو "تاثیر درد" اقبال کی "تصویر درد" کے مقابل میں لکھی ہے ۔ دونوں کے تجربات میں بہت حد تک یکسانیت ہے ۔ یہاں تک کہ جوش ملیح آبادی بھی اقبال کا خوشہ چیں ہے ۔ جوش کی وہ نظمیں جو "اسلامیات" کے تحت لکھی گئی ہیں ۔ اقبال کی ملی شاعری کی آوازِ بازگشت ہیں "شعلہ و شبنم" کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی اقبال کی گونج سُنائی دیتی ہے ۔ اور کون سا عصرِ حاضر کا نوجوان شاعر ہے جس نے اقبال کے مدرسہ میں تربیت نہیں پائی ۔ اکثر کے کلام میں اس تربیت کے اَمٹ نقوش ہیں ۔